اورینٹل کالج میگزین

اگست ۱۹۵۹ء

اورینٹل کالج

میگزین

اگست ۱۹۵۹ء

جلد ۳۵ عدد ۴ عدد مسلسل ۱۳۸

ایڈیٹر :—

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

٭

باہتمام مسٹر احسان الحق، ہیڈ کلرک، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
پرنٹر و پبلشر اورینٹل کالج میگزین، پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور
میں طبع ہو کر اورینٹل کالج لاہور سے شائع ہوا۔

سالانہ چندہ : چار روپے

ترتیب مضامین

سی - ۱۵۶ پنجاب یونیورسٹی پریس—۳۰۰—۵۹-۱۰-۲۴

رانا م ۔ ن ۔ احسان الہی

جمهرة النسب لابن الكلبی

متقدمین میں سے ابوالمنذر ھشام بن محمد بن السائب بن بشر الکلبی (المتوفی ۲۰۴ھ/۸۱۹ء)[1] کی تالیفات کو اساسی حیثیت حاصل ھے ۔ ادب اور تاریخ کا دامن ابن الکلبی کی روایات سے مالا مال ھے ۔ فحول علماء اور محققین نے ابن الکلبی سے بہت استفادہ کیا ھے اور بالعموم اسی کی روایت پر انحصار کیا ھے ۔

ابن الکلبی اگرچہ کوفہ میں پیدا ھوا اور کوفہ ھی میں اس نے نشوو نما پائی اور وھیں اپنے باپ سے علم حاصل کیا، لیکن اس نے بغداد میں، جو دنیائے اسلام کا مرکز بن چکا تھا، رہ کر ایک مدت تاریخ اور نسب پر درس دیا ۔ اس کے شاگردوں میں اس کے بیٹے العباس بن ھشام کے علاوہ محمد بن حبیب ، خلیفہ بن خیاط، محمد بن سعد کاتب الواقدی، محمد بن ابی‌السری، ابوحاتم البجلی اور ابوالاشعث احمد بن المقدام کے نام قابل ذکر ھیں ۔

ابن الکلبی کی اکثر تألیفات جن کی تعداد ڈیڑھ سو تک گنوائی جاتی ھے ناپید ھیں ۔ اس کی کتاب الاصنام اور کتاب الخیل شائع ھو چکی ھیں ، لیکن جمھرۃ انساب العرب کے منتشر اوراق اور غیر کامل نسخوں کو ابھی تک مرتب کر کے پیش نہیں کیا گیا ۔

۱۔ ابن الکلبی کی زندگی اور اس کی تصنیفات پر ایک مستقل مقالہ الگ پیش کیا جائیگا ۔

ذیل میں جمہرة کے اس نادر نسخہ کو پیش کیا جا رہا ہے جو برٹش میوزیم، لندن میں بذیل نمبر Add. 23,297 محفوظ ہے یہ نسخہ ۲۰۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ پہلا ورق خالی ہے۔ شاید جلد ساز کے ہاتھوں اوراق کی ترتیب بھی بگڑ گئی، چنانچہ ورق ۳٦ ظ کی عبارت کا تسلسل ورق ۹۹و کی عبارت سے جا ملتا ہے۔ اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ورق ۱۰۹ظ اور ورق ۱٦۰و کے درمیان سے کچھ اوراق گر گئے ہیں۔ اوراق پر پنسل سے رومن ہندسوں میں نمبر لگائے گئے ہیں ۔ اور پروفیسر لیفی دلا فیدا نے اسی شمار پر انحصار کیا ہے(۱) ۔

جمہرة کا یہ نسخہ علی بن حسن بن معالی (المعروف والدہ بابن الباقلاوی الحلی النحوی) نے ٦۰۳ھ (۱۲۰٦ء) میں نقل کیا ہے۔ اس نسخہ میں ابن الکلبی کے علاوہ دوسرے علماء کی تألیفات سے بھی اقتباسات لے کر درج کیے گئے ہیں : مثال کے طور پر چند مقامات پیش کیے جاتے ہیں : قال ابو جعفر هذا من غیر کتاب الکلبی کتبته من بعض ولد عطارد (ورق ٦۳و)؛ الرّبائع من غیر کتاب الکلبی (ورق ۷۵و)؛ قال ابن حبیب : قال جهم بن مسعدة (ورق ۱۷۲ظ)؛ قال عبدالکریم (ورق ۲۱۴ و)؛ قال ابن ابی السری (ورق ۲۴۵ظ)؛ من کتاب خرداذبه (ورق ۲۴٦و) ۔

وسٹنفلڈ کی کتاب *Genealogische Tabellen* کی طرز پر متعلقہ شجرہ ہائے نسب بھی ساتھ ساتھ شائع کئے جائیں گے ۔

---

(۱) البلاذري، انساب الاشراف (باعتناء S.D.F. Goitein) یروشلم، ۱۹۳٦ء

ورقة الاصل الخطية

الجزء الأوّل

من

جمهرة النّسب

تأليف ابى المنذر هشام بن محمّد بن السّائب الكلبىّ النّسابة

رحمه الله تعالى،

رواية محمد بن حبيب عنه

/ بسم الله الرّحمٰن الرّحيم وبه التّوفيق

أُخبرنا محمّد بن حبيبٍ عن هشام بن محمّد بن السّائب عن أَبيه عن أبى صالح عن ابن عبّاسٍ، قال: كان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم اذا انتهى فى النّسب الى مَعَدّ بن عَدْنانَ أَمسك ثم قال: "كذب النّسّابون"[1] قال الله جل ثناؤه (وَقُرُوناً بَيْنَ ذَلكَ كَثيراً ۝)[2] قال ابن عبّاس: ولو شاء رسول الله صلّى الله عليه وسلّم أَنْ يعلمَه لَعَلِمه. و قال: "بين معدّ بن عدنان و بين اسماعيل ثلاثون أباً" [3]

و حدّث هشام عن أبيه محمّد بن السّائب، قال: ولد أُدَدُ بن

---

(١) ابن دريد، ص ٢٠؛ النويرى، ج ٢، ص ٢٦٢؛ ابن كثير، البداية، ج ٢، ص ١٩٣؛ التفسير المظهرى، ج ٢، ص ٢٥٤

(٢) القرآن، س ٢٥، آ ٣٠.

(٣) ابن كثير، البداية، ج ٢، ص ١٩٣؛ التفسير المظهرى، ج ٢، ص ٢٥٤

زيد (١) عدنانَ (٢) و نَبتاً ونبتٌ هو الأشعر أبو الأشعريّين و عَمْراً درج
فولد نبتٌ شَقْرَةَ و هم فی مَهْرةَ بالشِّحْر و شَقْحباً و هم فی وُحاظةَ (٣) من
ذی الكلاع - فولد عدنانُ معدّاً والدّيثَ و أُبيّاً و العَيَّ درجا و عُدَيْناً (٤)
درج، وأمّهم مَهْدَدُ بنت اللّهمّ بن جَلْحب من جَديسٍ - فولد الدّيثُ
ابن عدنان الحرثَ و هوعكٌّ (٥) فولد عك بن الديث الشاهدَ و صُحاراً
و هو غالبٌ و سُبَيْعاً درج [و] (٦) قَرْناً و هم فی الأزْد بنوعلٍّ - فولد
الشّاهدُ بن عك غافقاً و ساعدةَ - فولد غافق بن الشاهد لِعسانَ
و مالكاً و القَيَانَةَ (٧) - فولد مالك بن غافق رِهْنَةَ وصُحاراً -/فولد رهنةُ
كَعْباً و طَرِيفاً و مالكاً - فولد صحار بن مالك عَبْداً و معاويةَ و ربيعة

---

(١) ادد بن زيد = ادد بن زيد بن يشجب بن عريب (يا عُريب) بن زيد بن كهلان بن سبا بن يشجب بن يعرب بن قحطان (معجم البلدان، ج ٣، ص ٣٧٠ -: ٣٦٩ ق ب ابن هشام، ص ٦ : ابن دريد، ص ٢١٨ - ٢١٧)-

(٢) یاقوت الحموی نے اس عدنان کو عدنان بن اُدّ بن ادد ظاہر کیا ہے (ارشاد، ج ٦، ص ٣٦٨ ؛ ق ب ابن ہشام، ص ٦-٥ ؛ المسعودی، التنبیه، ص ٨٠؛ الاغانی، ج ١، ص ٨ : القصْد، ص ١٦)- ایک اور مقام پر یاقوت نے ابن الكلبی اور ابن الاعرابی کے حوالہ سے کہا ہے کہ ادد بن زید کے چار بیٹے تھے :- مرّة، نبت (= الاشعر)، جُلْهمة (= طیّ) اور مالک (معجم البلدان، ج ٣، ص ٣٧٠ ؛ نیز ملاحظہ ہو ابن ہشام، ص ٥-٣ : ابن سعد، ج ١، قسم ١، ص ٢٩،٢٨ ؛ مصعب، جمهرة النسب، ورق ١ ظ؛ ابن نشوان، ص ٣٨) -

(٣) وحاظه = آحاظه بن سعد (معجم البلدان، ج ٣، ص ٣٣٥ و ٩٠٧) -

(٤) یقال " عدنا " (الطبری، ج ١، ص ١١١١) -

(٥) الطبری، ج ١، ص ١١١١، ١١١٢ (ق ب جداول وستنفلڈ A. 1-2، جہاں عک کو ابن عدنان بیان کیا گیا ہے) -

(٦) سہو کاتب

(٧) "الفیانة" جیسے نہ اصل اور المقتضب (ورق ٥٧ ظ) میں ہے - و ستنفلڈ نے اسے "القیاقة" پڑھا ہے (ابن حبیب ص ٥ ؛ جداول A-5) - لیفی پروفنسال کے نزدیک یہ نام "القیانة" ہے (ابن حزم، ص ٣٠٩) -

وولد لغسانَ بن غافقٍ الحُوثَةَ (١) و أُسَلَمَ ووائلاً و زَبانَ (٢) وخضرانَ(٣) وولد القياثةُ بن غافق أَحْدَبَ و اوفَى و أَسلَمَ(٤)وخَدِرانَ و كان من غافقٍ اوّل من جرّالنّواصى سَمْنَقةُ بن مُرَيٍّ (٥) بن الفُجّاعِ صاحب أَمْرِ ملكٍ يوم قاتلوا غسّان و رئيس غسّان زوبعة (٦) بن عمرٍو و ولد صحارُ بن علكٍ عَبْساً (٧) و بَوْلانَ و هما عدد علكّ و كان من بنى بولان مقاتلُ بن حكيم بنُ عبد الرّحمٰن الخُراسانيّ

فولد معدُّ بن عدنان نِزاراً و قَنَصاً (٨) و قُناصةَ وَسناماً و العُرْفَ درج وقُضاعةَ قال رجلٌ من مَهْرةَ [من الرّمل]

إنَّ أَخْوَا لِى مِنْ نَقْرَةَ قَدْ   لَبِسُوا لِى غَمساً جِلْدَ النَّمِرْ
تَحَنُوا أَثْلَتَنا ظُلْماً وَلَمْ   يَرْهبُوا غبَّ الْوَبَال الْمُسْتَمِرْ

---

(١) كذا فى الاصل - ياقوت نے اس نام کو ''الحرثه'' لکها هے (المقتضب، ورق ٥٧ ظ) -
(٢) ويقال ''ريان'' (المقتضب، ورق ٥٧ ظ) -
(٣) ق ب ابن حبيب، ص ٨-٧، جهاں لغسان کے چهٹے بیٹے کا نام ''اکرم'' درج هے (: ربّان بن اکرم بن غسان) -
(٤) الاصل : '' و اسلَمَ ''
(٥) ويقال ''سَلْقمة بن مُرَيّ'' (المقتضب، ورق ٥٧ ظ) -
(٦) لعلّه ثعلبة بن عمرو (ابن دريد، ص ٢٨٦ : الطبرى، ج ١، ص ١٧٤٤ ؛ المقتضب، ورق ١٧ و) -
(٧) الاصل : '' عَنْسا '' بالنون ؛ والتصحيح من ابن حبيب، ص ٢٢ والمقتضب، ورق ٥٧ و
(٨) الطبرى، ج ١، ص ١١١١ ؛ لسان العرب، ج ٨، ص ٣٥٢
اس کا تلفّظ یاقوت نے ''قُنُص'' درج کیا هے (المقتضب، ورق ١ ظ) - بعض کے نزدیک ''قُنَص'' هے (ابن هشام، ص ٧ ؛ ابن حزم، ص٨)- و یقال ''قبضة'' (النويرى، ج ٢، ص ٣٠٩) -

و قد انتسبوا فى حِمْيَر و عَوْفاً درج و شَكّاً درج و حَيْدانَ (١) درج و حَيْدَةَ (٢) و عُبَيْدَالرِّمَاح (٣) و هم فى بنى كنانة رهط إبراهيم بن عربىّ الّذى كان عبد الملك بن مروان يولّيه اليمامةَ و أمّ إبراهيم بن عربىّ فاطمةُ بنت شَريك بن سَحْماء (٤) الّذى لاعنه عاصمُ بن عديٍ فى امرأته / فلّما كان يوم الدّار يوم قُتل عثمان بن عفّان [رض] ضُرب مروانُ بن الحكم و سعيدُ بن العاص فسقطاً فوثبتْ فاطمةُ بنت شريك على مروانَ فأدخلتْهُ بيتَ القَراطيس فأَفْلَتَ - فكانوا يحفظون إبراهيم بن عربىّ و يُكرمونه و جُنَيْداً (٥) و هم فى علىٍ و أَوْداً و جُنادةَ و هو أبو كندةَ (٦) ؛ و قال أبو اليقظان " حيادة " و هو بالملْ و القَحمَ و امّهم مُعانة بنت جَوْشَم بن جُلْهُمَة (٧) بن عمرو بن هُلَيْنِيَة بن دَوّة من جُرْهم - فولد سنامُ بن معدّ جُشَمَ وحَا (٨) و هما حليفان الحكم بن سَعْد العَشيرة من مَذْحج (٩) وولد حيدةُ بن معدٍ بجيداً (١٠) بطنٌ عظيمٌ دخلوا فى الأشعريّين فينسبون منهم و أَفْلَحَ و قُزَحَ درجا - و ولد القحمُ بن معدٍ

---

(١) الاصل : "لحيدان"

(٢) و يقال "حبد" (النويرى، ج ٢، ص ٣٠٩) -

(٣) ابن حبيب، ص ٣٥ ؛ النويرى، ج ٢، ص ٣٠٩

(٤) فاطمة بنت شريک الانصارية من بلىّ (البلاذرى، انساب، ص ٤٩)

(٥) الاصل : "جُتيدا "

(٦) معجم البلدان، ج ٣، ص ٨١٤ ؛ بعض مؤرخين نے بنوکندة کو عدى بن الحارث ابن مُرّة بن ادد بن زيد سے منسوب کيا ہے (المقتضب ورق ٤٦ ببعد ؛ ابن حزم، ص ٣٩٩ ؛ النويرى، ج٢، ص ٢٨٧) -

(٧) الاصل : "جلهة" (ق ب الطبرى، ج ١ ص ٦٤٥ ، ١١١١) -

(٨) کذا بالاصل لعلّه "خارجة" (النّويرى، ج ٢، ص ٢٨٥) -

(٩) الاصل : "مذحج" بحاء مفتوحة -

(١٠) و يقال "مجيداً" (المقتضب، ورق ١ ظ) -

أَقْيانُ (١) - فولد إفيانُ غَنْثاً و رَوَوْا "غَتَّاً" و هم حيٌّ فى بنى مالك بن كنانة ابن خُزيمة - حكوا "غتّاً" عن الكلبيّ انّه قاله ولا يعرفه ابنُ حبيبٍ - وولد نزارُ ابن معدٍّ مُضَرَ و إيادًا(٢) و امّهما سودةُ بنت علّ بن الدّيث بن عدنان و ربيعةَ وأَنْمارًا(٣) و امّهما الحَذَالة (٤) بنت وِعْلان بن جوشم بن جلهمة(٥) بن عَمْرو بن هُلينية ابن دّوة - فولد مضرُ بن نزارٍ اليأس بن مُضَرو النّاسَ(٦) و هو عَيْلانُ و امّهما الرَّباب بنت حيدةَ بن معدّ بن عدنان - / فولد إليأسُ بن مضر عمرًا و هو مُدْرِكةُ و عامرًا و هو طابخةُ و عُمَيرًا و هو قَمَعَةُ (٧) و امّهم خِنْدِفُ و هى ليلى بنت حُلْوانَ بن عِمْران بن الحافِ بن قُضاعةَ - و كان اليأسُ خرج فى نجعة له فنفرتْ إبله من أرنبٍ فخرج إليها عمرو فأدركها فسمّى مُدْرِكة (٨) و خرج عامرٌ فتصيّد فطبخه (٩) فسمّى طابخه و انْقمع عميرٌ فى الخباء فسمّى قمعه و خرجت امّهم ليلى تمشى فقال لها اليأس : أين تُخَنْدفين فسمّيت خِنْدِف و الخَنْدَفةُ ضَرْبٌ من المَشْى - قال و لمّا انصرفوا و قد صنعوا ما سمّى قال لعمرو : أنت قد أدركت ما طلبتا ، و قال لعامر : و أنت قد انْضجتَ ما طبخنا ، و قال لعمير : و انت قد

---

(١) و يقال "أُفْسان" (ابن حبيب، ص ٣٨) -

(٢) بعض کے نزدیک "إیاد" غیر منصرف ہے (المقتضب، ورق ا ظ) -

(٣) "قال ابن اسحق : فأمّا أنمارفهو والد خثعم و بجيلة قبيلة جرير بن عبدالله البجلى و قد تيامنت فلحقت باليمن - قال ابن هشام : و اهل اليمن يقولون أنمار بن أراش بن لحيان بن عمرو بن الغوث بن نبت بن مالك بن زيد بن كهلان بن سبأ - قلت : والحديث المتقدم فى ذكر سبأ يدلّ على هذا ، و الله اعلم" (ابن كثير، البداية، ج ٢، ص ١٩٩) -

(٤) ويقال شقيقة بنت عل بن عدنان ، ويقال جمعة بنت عل بن عدنان (ابن كثير ، البداية، ج ٢ ص ١٩٩) -

(٥) الاصل : "جلهة"

(٦) ابن حبيب، ص ٣٢ ؛ ابن دريد، ص ١٦٢

(٧) ويقال "قَمْعة" (النّويرى، ج ٢ ص ٣٣٠) -

(٨) و بالحاشية : "و التاء فيها للمبالغة كالعلامة" -

(٩) الاصل : "فطبحة"

أسات و انقمعنا - فولد مدركةُ بن الياسَ خُزَيْمةَ و هُذَيْلاً و امّها سَلْمی (١) بنت اسلم (٢) بن الحاف بن قضاعه و غالباً و سعداً و قیساً درجوا لا أعقاب لهم و امّهم لیلی بنت السّیّد بن آلحاف ن قضاعه - فولد خزیمةُ بن مدرکة کنانةَ وامّه عوانهُ بنت سعد ن قیسٍ و یقال بل هند بنت عمرو ن قیس بن عیلانَ و أسداً و أسدةَ فجذامُ تنتسب إلی اسدة و عبدَالله و الهُونَ (٣) و امّهما بَرّة بنت مُرٍ أختُ تمیم ن مُرٍ- فولد / [ ] (٤) کنانةُ (٥) النّضْرَ و هو قیسٌ(٦) ونُضیراً و مالکاً و مِلْکانَ و عامراً و عمراً والحارثَ و غَزْوانَ (٧) و سعداً و عوفاً و غنْماً و مخْرمةَ (٨) و جَرْولاً بنی کنانة، و امّهم (٩) بَرّةُ بنت مُرٍّ أخت تمیم بن مُرٍّ حلف علیها کنانةُ بعد أبیه خُزیمة؛

(١) ویقال سلمی بنت سُوید (ابن درید، ص ٢٦ : جد اول M-6)

(٢) ابن حبیب، ص د

(٣) الاصل: ''الهوْن'' و التصحیح من ابن درید، ص ١١٠ و اغانی، ص ٩٠٨

(٤) الاصل : ''فولد'' ولابدّ من التصحیح -

(٥) ابن حبیب نے کنانہ کی اولاد میں ایک اور نام زائد بتلایا ہے : ''حُدال'' (ابن حبیب، ص ٣٦ ؛ المقتضب، ورق ١٧ و) - ابن کثیر نے ''حدال'' پر لام تعریف زائد کی ہے (البدایہ، ج ٢، ص ٢٠٠-١٩٩) -

(٦) و بالحاشیة: ''و قیس''
''و یقال اسم النضر قیس'' (النویری، ج ٢، ص ٣٣٣: ابن کثیر، البدایة، ج ٢، ص ٢٠٠) یاقوت نے بنو النضر کو صراحت کے ساتھ ''قریش'' کہا ہے (المقتضب ورق ١٧ و) لیکن اکثر مؤرخین کے نزدیک فهر بن مالک کی اولاد ہی قریش کہلانے کی مستحق ہے (القصد، ص ٦٧؛ ابن حزم، ص ١١؛ النویری، ج ٢، ص ٣٣٤-٣٣٣) -

(٧) الاصل : ''عزوان'' والتصحیح من الطبری ، ج ١ ص ١١٠٥ و المقتضب ورق ١٧ و

(٨) و یقال ''سخرم'' (المقتضب، ورق ١٧ و) و هو سهو -

(٩) بعض کے نزدیک برة صرف النّضر ہی کی ماں تھی (ابن کثیر، البدایة، ج ٢، ص ٢٠٠) - کتاب الاصنام للجاحظ کے حوالے سے الصّاوی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خزیمة کی بیوی برّة بنت مرّ بن ادّ بن طانجة نہیں تھی بلکہ اس کی پھوپھی برّة بنت ادّ بن طانجة تھی (معارف ص ٣٠)

و عَبْدَ مناة و أمّه الذّفراء (١) و هي فَكْهَةُ بنت هَنَيّ بن بَلِيّ بن عمرو بن الحاف ابن قُضاعة، و أخوه لامه عليّ بن مسعود الغسّانّي فحضن عليّ بن مسعود بن مازن بن ذئب أولاد عبد مناة فنسبوا إليه - فولد النّضرُ بن كنانة مالكاً و يَخْلَدَ (٢) و هم في بنى عمرو بن الحارث بن مالك بن كنانة والصَّلْتَ (٣) درج و خُزاعة ينسب الى الصّلت، و أمّهم عِكرِشة (٤) بنت عَدْوانَ و هو الحارثُ بن عمرو بن قيس ابن عَيْلان - فولد مالكُ بن النّضر فِهراً و إليه جماعُ قريشٍ و الحارثَ و امّهما جَنْدَلَةُ (٥) بنت عامر بن الحارث بن مُضاض الجُرْهُميّ فولد فِهرٌ و هو قريشٌ (٦) غالباً و أَسَداً و عَوْفاً و ذِئْباً و جَوْناً درجوا (٧) و الحارثَ بطنٌ و محاربا بطنٌ، و هما من قريش الظّواهِر، و أمّهم ليلى بنت الحارث بن تميم بن سعد بن هُذيل بن مُدْركة - / فولد أسدُ بن فهر مالكاً - فولد مالكُ بن أسدٍ حَمَلاً (٨) فادّعى إليه عبد شمسٍ و هم بطنٌ من العباد نصارى بالحِيْره فقالوا عبد شمس بن حَمَلٍ و هذا باطلٌ - فولد عوفُ بن فهر زُهْرةَ ابن عوف و صَفيةَ قال: درج أولاد فهرٍ كلّهم إلاّ غالباً و الحارثَ و محارباً - وولد غالبُ بن فهر لُؤَيًّا و تَيماً و هو الأَدْرَمُ، بطنٌ، و كان تيمٌ كاهناً وكان ناقصَ الذّقَنِ و هم منَ قريش الظّواهر و قَيْساً درجوا، كان آخر من بقى من بنى

---

(١) ويقال أُمّه هالة بنت سُويد بن الغطريف (ابن هشام، ص ٦٠)

(٢) الاصل: "نخلد" (ق ب المحبّر ص ٤٧؛ النويرى، ج ٢، ص ٣٣٣)

(٣) ابن حزم کے نزدیک الصلت مالک بن النضر کا بیٹا تھا (ص ١٠)

(٤) و هي عاتكة وهي الحصان (المحبّر، ص ٥٠؛ ابن دريد، ص ٢٦؛ النويرى، ج ٢، ص ٣٣٣) -

(٥) النويرى، ج ٢، ص ٣٣٣؛ ويقال هي جندلة بنت الحارث بن مضاض (ابن دريد، ص ٢٦) -

(٦) و بالحاشية: "مطلب فهر هو قريش فمن كان من ولده فهو قرشيّ و من لا فلا"

(٧) اى درجوا الّا غالباً

(٨) ويقال "جَمَلاً" بالجيم (المقتضب، ورق ٢ و)

قيس بن غالب رجلٌ هلك بالعراق أيّام خالد بن عبدالله في خلافة هشامٍ فبقى ميراثُه لا يُدْرَى من أحقّ به، و أمّ بنى غالب عاتكةُ بنت يَخْلُدَ بن النّضر و هى إحدى العَواتِك اللّواتى ولدْن رسولَ الله صلّى اللهُ عليهِ وسلّم (١)، و يُقال بل أمّهم سلمى بنت عمرو بن ربيعه بن حارثةَ من خُزاعة (٢) فولد لُؤَىُّ بن غالبٍ كعباً بطن وعامراً بطنٌ وسَامَةَ (٣) بطنٌ و أمّهم ماويّةُ (٤) بنت كعبِ بن القَيْنِ بن جَسْرِ بن شَيْعِ الله بن أسد بن وَبَرَةَ و عوف بْنَ لُؤَىّ بطنٌ و أمّه الباردةُ (٥) بنت عوف بن غَنْم (٦) ابن عبد الله بن عفّان (٧) لم يلد أبو (٨) الباردة غيرَها و خُزَيمةَ بن لُؤَىٍّ بطنٌ و هم/[ ] (٩) عائذةُ قُرَيشٍ (١٠) وسَعْدَ بن لُؤَىٍّ بطنٌ و هم بُنَانَةُ (١١)

(١) ابن حبيب نے بارہ عواتک کا ذکر ہے (المحبّر، ص ٤٧ تا ٥١)- ق ب الحديث : "انا ابن العواتک من بنى سُلَيم" (ابن سعد، ج ا، ق ا، ص ٣٣ : ابن الاثير، النهاية، ج ٣، ص ٦٦ ؛ السيوطى، الجامع الصّغير، ج ا، ص ٨٩ -

(٢) ابن دريد، ص ٢٦ ؛ النويرى، ج ٢، ص ٣٣٥ -

(٣) ويقال "أسامة بن لؤىّ" (النّويرى، ج ٢، ص ٣٣٥ ببعد) و هو سهو والتصحيح من ابن حبيب، ص ٣

(٤) الطبرى، ج ١، ص ١١٠٠ : ويقال هى ماوية بنت القين بن جسر الخ (المحبّر، ص ٥٠) ؛ ويقال هى مارية بنت كعب القُضاعية (النويرى، ج ٢، ص ٣٣٦) ؛ ويقال هى وَحْشية بنت شيبان (ابن دريد، ص ٢٦)-

(٥) الطبرى، ج ١، ص ١١٠١

(٦) الاصل : تميم

(٧) و بالحاشيه : بن عوف بن غنم بن عبدالله ه

(٨) الاصل : آلُو

(٩) الاصل: و هم

(١٠) يُعرفون باسمهم عائذة بنت الخِمْس بن قُحافة الخَثْعَمىّ (ابن دريد، ص ٦٧)؛ ويقال و هم بنو الحارث بن مالك بن عُبيد بن خُزيمة بن لؤىّ و عائذة (؟) امّ الحارث هذا؛ ويقال الحارث بن مالك بن عوف بن حرب بن خزيمة بن لؤىّ (النويرى، ج ٢، ص ٣٣٦)-

(١١) ابن هشام، ص ٦٢؛ ابن دريد، ص ٦٧؛ الطبرى، ج ١، ص ١١٠١؛ القاموس ص ٨٦٣ - ق ب النويرى، ج ٢، ص ٣٣٥ : "و سعد واليه ينسب بنو نَباتة بفتح النون وضمّها و هى امّ سعد بن لؤىّ بها يعرفون و اليها ينسبون، و قيل نُسبوا الى حاضنةٍ لهم اسمها نباتة من بنى القين بن جسر بن شيع الله" و قيل نباتة اسم رجلٍ (القاموس، ص ٩٨)

والحارثَ بن لُؤيّ بطنٌ و هم بنو جُشَمَ و جشمُ كان عبداً حَبَشِيّاً حضن الحارثَ فغلّبَ عليه (١) و جُشَمُ حُلفاء لبنى هِزّانَ من عَنَزَةَ بن أسد بن ربيعةَ بن نِزارٍ ، فأمّا عوفُ بن لؤيّ فانّه لحقَ بغَطَفانَ (٢) فنزل فى منزلٍ وارتحل النّاسُ فمرّ به فَزارةُ فقال : [من الرجز]

عَرّجْ عَلَيَّ بنَ لُوَيّ جَمَلَكْ تَرَكَكَ القَوْمُ فلا منزلَ لَكْ

فولد عوفٌ مُـرَّةَ فهم فى غطفانَ يقولون مُرّةُ بن عوف بن سعد بن ذُبْيانَ بن بَغيضٍ (٣) و منهم الحارثُ بن ظالمٍ و قد جعل ينتسب فى شعره الى قريش فقال (٤) [من الوافر]

رَفَعْتُ الرُّمْحَ إذْ قالُوا قُرَيْشٌ و شَبَّهْتُ الشَّمائِلَ و القِبَابَا

فَمَا قَوْمِى بِثَعْلَبَةَ بْنِ سَعْدٍ وَ لاَ بِفَزارَةَ الشُّعْرِ الرِّقَابَا

و كان عُمر بن الخَطّاب يقول لو ادَّعَيْتُ حَيّاً من العرب لادَّعيتُهم و أمّا الحارثُ ابن لؤيّ فكانوا زماناً فى بنى هِزّانَ من عَنَزَةَ فقال جَريرُ بن الخَطَفى ينسبهم إلى قريشٍ (٥) [من الطويل]

بَنِي جُشَمٍ لَسْتُمْ لِهِزَّانَ فَانْمُوا لِفَرْعِ الرَّوابِي مِنْ لُؤَىّ بنْ غالِبِ

وَلاَتُنْكِحُوا(٦) فِيآلِضَوْرٍ (٧) بَنَاتِكُمْ وَ لاَ فِي شَكِيسٍ بِئْسَ حَيُّ الغَرَائِبِ

---

(١) و قيل و الحارث هو جشم (المحبر، ص ١٦٨)
النويرى نے لوّی کے آٹھ بیٹوں کے نام گنوائے ھیں :- کعب، عامر، اسامة (؟)، خزيمة، سعد، الحارث، عوف، جشم (النويرى، ج ٢، ص ٣٣٥)
(٢) ابن هشام، ص ٦٣
(٣) ابن هشام، ص ٦٤
(٤) ق ب ابن‌هشام، ص ٦٤؛ المحبّر، ص ١٦٩ ؛ المفضّليّات ٨٩ ب ١٥ و ٨ بالترتيب؛ الاغاني، ج ١٠، ص ٢٨
(٥) ابن هشام، ص ٦٢؛ ابن حزم، ص ٢٤٧؛ مخطوط Add. 22376 بالمتحف البريطانوى، ورق ٢٠ ظ؛ ابن دريد، ص ١٦٩ ح
(٦) الاصل : ولاسكحو
(٧) الاصل : ضونٍ
وقيل ولا تنكحوا فى آل صور نسائكم   الخ (ابن دريد، ص ١٩٦ ح)

/ضَوْرٌ وشَكْسٌ من عَنَزَةَ و انّما قال شكيس للشّعر؛ و كانت عائذةُ و بُنانة في شيبانَ
وولد كعب بنُ لؤيٍّ مُرّةَ و هُصَيصاً و أمّهما مَخْشيّةُ (١) بنت شيبان بن
محارب بن فهر و عديَّ بنَ كعبٍ (٢) بطن و أمّه رَقاش بنت رُكْبةَ بن بَلْبَلَةَ (٣)
ابن كعب بن حَرْب بن تميم بن سعد بن فهم (٣) بن عمرو بن قيس بن عيلانَ
فولد مُرّةُ بن كعب كلاباً و امّه هند بنت سُرَيْرِ (٥) بن ثعلبةَ بن الحارثِ بن مالك
ابن كِنانةَ و تيم بن مُرّةَ (٦) بطنٌ و يقَظَةَ و أمّهما أسماءُ بنت سعد بن عَدِي
ابن حارثة بن بارِقٍ من الأزد (٧) فولد كلابُ بن مُرّةَ قُصَيّاً و اسمه زيدٌ و هو
مُجَمِّعٌ (٨) و زُهرةَ و نُعْمَ و أمّهم فاطمةُ بنت سعد بن سَبَلٍ (٩) و هو خَيْرُ بن

---

(١) ويقال هي وَخْشية بنت شيبان الفهرية (ابن قتيبة، المعارف، ص ٥٧؛ النويرى، ج ٢، ص ٣٣٧)؛ ويقال ام مُرّة ماويّة بنت كعب بن القين ابن جسر من قضاعة (ابن دريد، ص ٢٥)

(٢) و بالحاشية: "مطلب عدى: من ولده عمر بن الخطّاب رضى الله عنه فيجتمع مع النّبيّ صلّى الله عليه و سلّم في كعب" - ١٢

(٣) ويقال هي رقاش بنت ركبة بن نائلة الخ (الطبرى، ج ١، ص ١١٠٠) و صوابه "بلبلة" (المقتضب، ورق ٥١ ظ)-

(٣) الاصل: فهر؛ وبالحاشية: "صوابه فَهْم صح" (ابن دريد، ص ١٦٢، المقتضب، ورق ٥٠ ظ)

(٥) الاصل: سُرَيد - ويقال امّه هند بنت سُرَيرة بن ثعلبة الخ (المحبر، ص ٥١)؛ و يقال هي هند بنت سَرِير (ابن دريد، ص ٢٥؛ الطبرى، ج ١، ص ١١٠٠)؛ و قيل هي نعيم بنت سَرِير الخ (ابن قتيبة، المعارف، ص ٥٧)-

(٦) و بالحاشية: "هذا تيم بن مرّة الّذى ينتسب اليه ابوبكر الصدّيق رضى الله عنه يلتقى مع النّبى صلّى الله عليه و سلّم في مُرّة -"

(٧) ولد عدىّ بن حارثة بن امرئ القيس البطريق بن ثعلبة بن مازن بن الازد ابن الغوث سَعْداً و هو بارق (المقتضب، ورق ٦٩ و) و يقال: سعد بن عدىّ بن حارثة بن عمرو مُزَيقياء بن عامر ماء السّماء بن حارثة الغطريف بن امرئ القيس البطريق بن ثعلبة بن مازن بن غسّان (و هو السراج) بن الازد بن الغوث (النويرى، ج ٢، ص ٢٩٧ و ٣٠١)

(٨) ابن هشام، ص ٨٠؛ ابن قتيبة، المعارف، ص ٣٢؛ النويرى، ج ٢، ص ٣٣٨

(٩) الطبرى، ج ١، ص ١٠٩٢؛ ابن سعد ١/١، ص ٣٣؛ المحبّر، ص ٥٢؛ ويقال هي فاطمة بنت سَهْل الازديّة (ابن دريد، ص ٢٥؛ النويرى، ج ٢، ص ٣٣٨)

ڈاکٹر نذیر احمد ، مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ

کلیم کی ہندوستان میں آمد

عام طور پر یہ خیال ہے کہ کلیم ایران سے ہندوستان آیا اور جہانگیر کے ایک امیر شاہ نواز[1] خاں صفوی سے وابستہ ہو گیا۔ ۱۰۲۸ھ تک یہاں مقیم رہا ، پھر وطن واپس ہوا اور وہاں دو سال تک رہا۔ اس کے بعد ہندوستان آ گیا اور امرائے جہانگیری میں مرزا محمد امین میر جملۂ شہرستانی سے جو تازہ تازہ ایران سے جہانگیر کی دعوت پر آیا تھا، متعلق ہو گیا۔ چنانچہ خزانۂ عامرہ[2] میں ہے :

> در عہد جہانگیر بسیر ہند خرامید و با شاہ نواز خان بن میرزا رستم صفوی مربوط گشتہ رعایت فراوان یافت، در ثمان و عشرین و الف بایران برگشت . . . و بیش از دو سال در ولایت اقامت نکردہ دوبارہ خود را بہند کشید و چندے با میر جملہ شہرستانی بسر برد۔

مولانا شبلی[3] نے سرو آزاد کے حوالے سے اسپر اتنا اور اضافہ کیا ہے :

> اس سلسلے میں یہ بات بھی کہنے کے قابل ہے کہ جس سال، یعنی ۱۰۲۸ھ میں طالب آملی کو ملک‌الشعرائی کا خطاب ملا ہے، اسی سال کلیم ایران کو واپس گیا ہے۔

۱- ملاحظہ ہو مأثرالامرأ جلد ۲، حرف ش، ص ٦٧٠-٦٧٦۔

۲- ص ۳۸۱ -

۳- شعرالعجم ج ۳ ص ۱۹۵ -

اس کے بعد بطور نتیجہ یہ بھی لکھا ہے :

اس سے بدگمان طبیعتیں نتیجہ نکال سکتی ہیں کہ کلیم کو رشک نے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا ہوگا۔

لیکن میرے نزدیک کلیم کا پہلی بار دربار جہانگیری میں آ کر شاہ نواز خان صفوی سے وابستگی کا خیال ہی صحیح نہیں۔ اس کے نتیجے میں واپسی ایران کے واقعے کو طالب آملی کی ملک‌الشعرائی سے کوئی نسبت نہیں معلوم ہوتی ۔ البتہ یہ بالکل صحیح ہے کہ ۱۰۲۸ میں کلیم واپس گیا ہے جیسا کہ اس قطعے[1] سے صاف ظاہر ہے :

طالب ز ہوا پرستی ہند برگشت سوی مطالب آمد
تاریخ توجہ عراقش 'توفیق رفیق طالب، آمد

در اصل کلیم اوائل عمری میں بغرض تحصیل شیراز آ گیا اور کچھ ہی دنوں بعد وہ عازم ہند ہوا اور سیدھا بیجاپور آیا ۔ یہاں مولانا عنایت اللہ شیرازی[2] شاہ نواز خان کے لقب سے ملقب اور ابراہیم عادل شاہ ثانی بادشاہ بیجاپور کا وزیر مقرر ہو چکا تھا ۔ کلیم اس سے وابستہ ہو گیا ۔ تذکرہ نویسوں کی غلط فہمی کی بنیاد دو باتوں پر ہے ۔ ایک یہ کہ شاہ نواز خان نام کا ایک امیر شمالی ہند میں اسی زمانے میں موجود تھا ۔ کلیم کے دیوان میں شاہ نواز خان بیجاپوری امیر کی مدح میں کئی نظمیں ہیں، ان نظموں کو کسی وجہ سے جہانگیری دربار کے شاہ نواز خان کی مدح میں سمجھ کر کلیم کی دربار جہانگیری میں آمد

۱- دیوان مطبوعہ تہران ص ۷۸ -
۲- تاریخ فرشتہ جلد ۲ ص ۷۸ ببعد -

قیاس کر لی گئی ۔ دوسری بات یہ ہے کہ دکن میں کچھ دنوں کلیم مرزا محمد امین شہرستانی میر جملہؑ محمد قلی و قطب شاہ سے بھی وابستہ رہا ہے ۔ اتفاق سے یہی شخص ۱۰۲۷ ھجری میں جہانگیر کے دربار میں چلا آیا ۔ کلیم کے مدحیہ قصیدوں سے جو مرزا کی تعریف میں ہیں، یہ خیال کر لیا گیا کہ یہ قصیدے کلیم کی دوبارہ آمد پر ۱۰۳۰ ھجری کے بعد لکھے گئے ہونگے ۔ میرے اس قیاس کی بنیاد کہ کلیم شمالی ہندوستان کی بجائے بیجا پور آیا تھا ، حسب ذیل امور پر ہے ۔

(۱) معاصر تذکرہ نویس ناظم تبریزی[1] اور طاہر نصر آبادی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاہ نواز خان سے متعلق رہا ہے ۔ اور بادشاہ نامہ[2] سے بھی واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان آنے سے قبل کلیم جنوبی ہند میں مقیم رہا ہے ۔ مولانا شبلی نے بھی شاہجہان نامے کے حوالے سے لکھا[3] ہے کہ دربار میں پہنچنے سے پہلے کلیم کو جا بجا کی خاک چھاننا پڑی اور وہ دکن میں مارا مارا پھرا ۔

(۲) خود کلیم کے کلام سے داخلی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیجا پور میں شاہنواز خان شیرازی کا ملازم رہا ہے ۔

(۳) شمالی ہند کے امیر شاہ نواز خان صفوی کی مدح سے کلیم کا دیوان یکسر خالی ہے ۔ اور تعجب اس پر ہے کہ مطبوعہ دیوان میں ایک بھی نظم ایسی نہیں جسکا تعلق جہانگیر سے ہو ۔

۱- نظم گزیدہ ورق ۱۸۶ ب تذکرۂ نصر آبادی ص ۲۲۰ -

۲- جلد اول ص ۴۰۴ -

۳- شعرالعجم جلد ۳ ص ۱۸۵-۱۸۶ -

ناظم تبریزی نظم گزیدہ[1] میں لکھتا ہے جو طاہر نصر آبادی بیان بالکل مطابق ہے -

از شیراز متوجہ ہند شد و در خدمت شاہنواز خان نشو و نما یافتہ، بعد از فوت شاہنواز خان منظور نظر تربیت مرزا محمد امین شہرستانی کہ در گلکندہ میر جملہ بود، گشتہ . . . و در سنہ ۱۰۲۸ بعراق معاودت نمودہ -

اگرچہ اس سے صاف طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ طاہر اور ناظم کی مراد دکنی شاہ نواز سے ہے ، یا شمالی ہندوستان کے - لیکن چند باتوں سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دونوں مصنفوں کی مراد بیجاپوری شاہ نواز سے تھی - اول یہ کہ مرزا محمد امین ۱۰۱۱ھ تا ۱۰۲۰ھ گول کنڈہ میں محمد قلی قطبشاہ کا میر جملہ تھا - دکنی شاہ نواز اس کا معاصر تھا - اگرچہ آخرالذکر کی وفات ان سنین کے بعد ہوئی ہے، لیکن یہ مسلم ہے کہ چند ہی دنوں بعد میر جملہ کی حیات میں اس کا انتقال ہو چکا تھا - اس کے برخلاف شمالی ہند کا امیر شاہجہان کے دور میں مدتوں زندہ رہا اور اس کی وفات کے بعد میر جملہ کی خدمت میں ۱۰۲۰ ہجری تک پہنچنا ناممکن امر ہے - دوم یہ کہ ۱۰۲۰ کے قبل کلیم کا قیام دکن بخوبی ثابت ہے، قرین قیاس یہی ہے کہ دکن کے ایک دربار سے وہیں کے دوسرے دربار، یعنی گلکنڈہ کے قطب شاہی دربار میں پہنچا ہوگا - تیسرے یہ کہ کلیم اختری یزدی[2] کا ساتھی تھا اور اختری نظم گزیدہ کی روایت کی بنا پر دکن ہی میں

۱- ورق ۱۸۶ ب اور تذکرۂ نصر آبادی ص ۲۲۰ -

۲- نظم گزیدہ ورق ۴۹، ۱۸۶ وغیرہ -

تھا ۔ چوتھے یہ کہ بادشاہ نامے[1] میں ہے کہ شمالی ہند میں پہنچنے کے قبل دکن میں عرصے تک رہ چکا ہے :

اگرچه مدتی در سر زمین دکن و برخی دیگر ممالک هند بسر برده طرف از کامروائی نه بسته بود ۔

اب کلیم کے دیوان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے ۔ دیوان میں حسب ذیل پانچ نظمیں[2] شاہ نواز خان سے متعلق ہیں ۔

۱ ۔ قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے :

ز آه و نالهٔ دلهای مستمند اسیر
فغان ز زلف تو خیزد چو ناله از زنجیر

۲ ۔ قصیدہ جس کا عنوان یہ ہے :

در تعریف از قصر بلند پایهٔ نواب شهنواز خان

۳ ۔ قطعہ بعنوان ذیل :

هنگامی که در بیجاپور مورد سوء ظن قرار گرفته و بحبس افتاده است

۴ ۔ قطعه در مدح شهنواز خان موقعی که ظاهراً تحت نظر قرار گرفته بود ۔

۵ ۔ مثنوی بعنوان کتابهٔ عمارت شهنواز خان (از امرای شاه جهان) ۔

۱۔ جلد اول ص ۴۵۴ ۔
۲۔ ص ۳۳، ۳۶، ۶۸، ۶۹ و ۳۶۹ ۔

اب وہ اشعار ملاحظہ فرمائیے جن سے اندازہ ہوگا کہ شہنواز خان کا تعلق شاہ جہان سے نہ تھا بلکہ وہ عادلشاہی امیر اور ابراہیم عادلشاہ کے متوسلین میں تھا اور یہ کہ مثنوی کے عنوان کے بعد قوسین کی عبارت غلط ہے ۔ قصیدہ نمبر ۲ کے چند اشعار یہ ہیں :

اے بنایت بسان کعبہ شدہ در زمان شۂ خلیل اطوار
خسروانہ سپہر ابراہیم کار فرمائے ثابت و سیّار
بیشۂ ظلم نار نمرودی گلشن عدل آب دریا بار
شہریاری کہ پاس ملکش را بخت نواب خان بود بیدار
خان جم رتبہ شہنواز کہ ہست نقد شاہی ازو تمام عیار

دوسرے شعر میں بادشاہ کا نام صراحۃً ابراہیم اور اسکی رعایت سے پہلے شعر میں اسکو خلیل اطوار کہا گیا ہے ۔ تیسری بیت کے لفظ ”عدل“ سے عادلشاہی حکومت کی طرف لطیف اشارہ مقصود ہے ۔ غرض ان اشعار سے ظاہر ہے کہ شاہ نواز خان ابراہیم عادل شاہ کا ملازم تھا ۔

آخری نظم (یعنی مثنوی) کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

ز تمثال شہ و گلہائے بیخار در ایوان بینی ابراہیم و گلزار
شہ عادل خدیو ملک اقبال گشاد جبہہ اش امید را فال
بر آن یوسف لقای مسند آرا عروس ملک مفتون چو زلیخا
خلیل آسا بنوعے بت شکستہ کہ نظم ’با‘ و ’تا‘ از ہم گسستہ
ستم در روزگارش میر عدل است سر زلف بتاں زنجیر عدل است

محل میں بادشاہ کی تصویر پھولوں کے درمیان ایسی معلوم ہوتی تھی گویا ابراہیم پر آگ گلزار ہو گئی ہے ۔ اس سے بادشاہ کا نام ابراہیم

۳- جلد اول ص ۳۵۴

صریحی طور پر معلوم ہو گیا ۔ دوسری بیت میں شاہ عادل کہکر بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کی طرف اشارہ ہے۔ تیسرے، چوتھے اور پانچویں شعر سے ابراہیم عادلشاہ ہی مراد لیا جا سکتا ہے ۔ اس سلسلے میں ابراہیم عادلشاہ کے درباری شاعر ظہوری کی سہ نثر سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

بت شکن گشت چو خلیل نخست بادش ارزانی اعتقاد درست

در دل دلبران تصرف ازو عشق یعقوب و حسن یوسف ازو

گلزار ابراہیم در رخسار یوسف طلعتان نمرود نخوت رسانیدہ ......
سمی خلیل خود یعنی ابراہیم عادل شاہ را الخ

عارضی بہ شگفتگی گلزار ابراہیم الخ

خلیل نوال یوسف جمال داود الحان الخ

یہ مثالیں ابراہیم عادل شاہ کے لیے آئی ہیں ، کلیم کے اشعار ان سے بہت مشابہ ہیں ۔ اس لیے ان کا ابراہیم عادل شاہ کے لیے مخصوص ہونا یقینی ہے ۔

دونوں قطعے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے ایک ہی واقعے سے متعلق ہیں، پہلے قطعے میں واضح طور پر کلیم نے بیجاپور میں اپنی گرفتاری کا ذکر کیا ہے اور دوسرے میں گرفتاری اور بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے شاہ نواز خان سے مدد طلب کی ہے ۔ غرض یہ قطعے ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں ۔ پہلے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

فلک قد را نمی پرسی کہ گردوں چرا آرزد مارا بے محابا

چرا زد راہ بیمار غمے را کہ می آید بدرگاہ مسیحا

بعزم سیر بیجاپور گشیم رهے با آختری خوش دشت پیما
دو بال طائر شوقیم و هر دو نمی بودیم یکساعت شکیبا
ولے آخر ز چشم زخم گردون عجائب سنگ راهے گشت پیدا
بچنگ راهداران اوفتادیم چگویم تا چها کردند با ما
یکی میگوید اینان را بکاوید که شاید نامهٔ گردد هویدا
کنون در چنگ ایشان مبتلایم نمی دانیم چاره جز مدارا
نباشد عار اگر خاك درت را ز نقش جبههٔ هر بے سر و پا
اشارت کن که چو اقبال گردیم بخاك آستانت جبهه فرسا

ان اشعار سے ظاهر هے که کلیم اور اختری بیجا پور آتے هوے پکڑے گئے۔ دونوں ایرانی مسافر آرزو مند هیں که بیجا پوری امیر کے آستانے کی جبهه سائی کریں ـ ظاهر هے که یه آستانه سوامے شاه نواز خان شیرازی کے اور کوئی نه تها، کیونکه اس قطعے کے فوراً بعد جو دوسرا قطعه هے اس میں صراحةً اس امیر کا نام آیا هے اور عنوان میں اسکے ماخوذ هو جانے کا اشاره ملتا هے ـ قطعے کے چند اشعار درج ذیل هیں :

حدیث شکوۂ گردون بلند خواهم کرد
مگر بدرگه خان جهان رسد فریاد
پناه اهل هنر شهنواز خان که کند
ز راے روشن او آفتاب استمداد
زهے شکستهٔ اهل هنر درست از تو
چه واقعست که مارا نمی کنی امداد
سزاے بے گنهان گر چنین بود، چه کنم
بفرض اگر گنهی کس بما کند اسناد

بکنج ده منی سی روزه مست رسوا را
زمانه چله نشین کرده است چون فرهّاد
روا بود که فراموش کردهٔ از من
خصوص از پی صد گونه شکوه و بیداد
گرفتم اینکه رهے می دهی بخاطر خویش
ز بسکه مضطربم زود میروم از یاد
رضاے آمدن از نیست، رخصت رفتن
کرم نما که درین ده نمیتوان استاد
بداں مثابه از ایں آمدن سبک شده ام
که همچو موج بپس میروم به جنبش باد
هزار کوه غمم سنگ راه شد، تا کے
ز نوک خامه کنم کار تیشهٔ فرهاد
کلیم گوهر ارزنده ایست حیرانم
که از کجا بکف طالع زبوں افتاد

ان اشعار سے یه بات طے هو جاتی هے که گرفتار هو جانے کے بعد اس نے شاه نواز خان سے مدد طلب کی اور اسکے توسط سے کلیم کو رهائی ملی، چنانچه اس کے بعد وه بیجاپور میں چند دنوں مقیم رها جیسا که ذیل کے اشعار و واقعات سے ظاهر هے۔

کلیم نے ایک رباعی میں نورسپور کا ذکر کیا هے ۔ یه وهی شهر هے جو ابراهیم عادلشاه ثانی کے حکم سے بیجاپور سے مغرب میں چند میل کی دوری پر ۱۰۰۸ کے بعد بسایا گیا تها ۔ وه رباعی یه[1] هے :

شبهاز چراغ و شمع در نورسپور هر ذره زند لاف تجلی با طور
هر روز زشوق ایں چراغاں تا شب خورشید فتیله تابد از رشتهٔ نور

(۱) ۳۱۴ رباعی نمبر ۴۴ -

یه اشعار ایسے شخص کے ہو سکتے ہیں جس نے خود شہر کا چراغاں دیکھا ہوگا، اس لیے ان ایام میں کلیم کا قیام بیجاپور واضح ہے -

فرشتہ کی روایت کے بموجب ۱۰۰۶ ہجری (۱) میں شاہ نواز خان کو یہ لقب ملا اور انہیں تاریخوں میں اس نے بادشاہ کی خواہش پر بیجاپور میں ایک عالیشان عمارت تیار کرائی - عمارت کا تفصیلی بیان تاریخ فرشتہ کے دو تین صفحات میں ہوا ہے - اس میں سے بعض حصے درج ذیل ہیں :

خان والا منزلت بمعماری دولت روز افزوں قصرے و پیشگاهی بنا نهاد ...... طرح آں عمارت بریں نهج است ، چهار دیوار دارد که ضلع او قریب چهار صد گز شرعی است : جانب شمال دو دروازه کشاده میشود - یکی دروازه ایست بغایت رفعت و بزرگی و بجانب بازار که مشهور است ببازار شاه نواز خان ، باز میشود - دروازهٔ دیگر واقعست نزدیک چار سوی دربار شاهی و بالاے ایں دروازه عمارتیست مثمن مسمی بنورس بهشت - از دروں و بروں، بوم و دیوارها را مطلا ساخته نقاشان چیره دست صورتهای مرغوب بر آں کشیده اند - مردے که بدارالاماره تردّد می نماید اول به تماشای آں مشغول گردیده واله و شیدای صورتها میشوند بعده به تکلیف و زجر طبیعت از آنجا قدم پیشتر میگذارند .... در وسط حقیقی آں چار دیوار عمارتیست در نهایت ارتفاع مشتملبر ایوان طولانی که دو طرف آں حجرهاست و ایں صفه

---

(۱) تاریخ فرشتہ کے دونوں مطبوعہ نسخوں میں سنہ ''الف'' ہے جو قطعی غلط ہے - البتہ حکمی نسخے نمبر $\frac{۳۹}{۲}$ لٹن (مسلم یونیوسٹی لائبریری) ورق ۳۱۴ الف ''پرست والف ''ہی اوریہی درست ہے -

رو بشمال است در نہایت زیبائی . . . و درو دیوار این عمارت و عمارات دیگر کہ در آن محوطہ واقع است بسرکاری صفاے شیرازی کہ مردیست بہمہ حیثیت آراستہ، ساختہ شدہ و بطرز عمارات ''نورس بہشت'' ہمہ مصور و منقش اند بنوعیکہ لطافت اشکال و غرابت تمثال خال انفعال بر عارض نگارخانہ چین نہادہ . . .

۱۰۱۰ ہجری میں شاہ نواز خاں شیرازی کے یہاں لڑکا پیدا ہوا ۔ بادشاہ اسی محل میں شہزادے کی پیدائش پر مبارک باد دینے تشریف لے گیا تھا ۔ خان نے اس موقع پر ایسی آینہ‌بندی کی تھی کہ بیجاپور میں لوگوں نے کبھی نہ دیکھی تھی ۔ بادشاہ وہاں کی تصاویر سے بے حد متأثر ہوا تھا :

و حضرت سلیمانی چوں منزل خان فلک نشان رسید قریب یک ساعت نجومی بہ تصاویر دہلیز و ایوان پیش درگاہ مشغول گشت و بعد ازاں متوجہ عمارات نورس بہشت شدہ الخ ۔

کلیم شاہ نواز خاں کی عمارت سے اتنا متأثر ہوا کہ پانچ نظموں میں سے تین میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ۔ فرشتہ کے بیان سے ظاہر ہے کہ عمارات میں تصاویر خاص طور پر جاذب نظر تھیں ۔ کلیم نے بھی ان تصاویر کا بڑے مزے سے ذکر کیا ہے :

کند تا صورت ایوان تماشا   نہادہ عرش کرسی تا تہ پا

درو از صورت نواب دوراں   بہر سو ہست صد خورشید تاباں

ز بس افراخت او را دست ہمت   بچین صورتگراں حیران صورت

ز تمثال شہ و گلہای بیخار   در ایوان بینی ابراہیم و گلزار

عصای پیری گردون ستون خانهٔ تست
مگوی خانه بگو کارخانهٔ تقدیر
هزارها به تماشای غرفه‌ها رستد
اگر عدو را از بامش افگنند بزیر
مصورش قلم از موی زهره میسازد
قلم چو درکف او سوده گردد از تصویر
سپهر را بتماشای او مده رخصت
مباد باز جوان گردد این ستمگر پیر

ان عمارات کے باغ کا ذکر فرشته نے بڑے مبالغه آمیز انداز میں کیا هے :

وباغ و بستانی که در اطراف آن کاخ و ایوان واقعست گل و ریحان درکنار و جیب دیده وران گذاشته و چمن چمن سبزه و شگوفه در نظر صاحب نظران جلوه داده ....

کلیم بهی باغ کیطرف اشاره کرتا هے :

ببال فاخته هر روز بسته می آید
بسوی باغش مکتوب سرو از کشمیر
ز عرصهٔ چمنش یکقدم برون ننهد
که فال قرعه نبیند صبا ز موج غدیر
ز فیض باغ شود ناله سبز در منقار
چو عندلیب بگل درد دل کند تقدیر
بهار یک چمنش را اگر اجاره کند
هزار خرمن گل بیش می کند توفیر

نہال را بعمارت ہوای ہمدوشی است
باغ نامیه از بس نمی کند تقصیر

فرشته نے عمارت کے ذکر میں لکھا ہے :

اکثر اوقات نواب خاں در آن عمارت که مشرفست بر اکثر عمارات بیجاپور ، بزم عشرت آراسته مردم اهل طبیعت بصحبت فیض بخش او اختصاص می یابند و شراب بیغش سرور و حضور نوش کرده علی الرغم فلک ستم پیشه داد لهو و طرب میدهند :

اب کلیم کے اشعار ملاحظه ہوں :

صلاے عیش درو بسکه میزنند بهم
چو برگ گل شده منقار بلبلاں ز صفیر
همیشه بادا در سایهٔ درختانش
بساط عیش تو گسترده و نهاده صریر
بآں گلی که تو در روی او پیاله کشی
یکی هزار شود شوق عندلیب اسیر
شگفتگی گلستانش از نسیم مدان
هواے بزم شراب تو میکند تاثیر
چو بزم عیش و نشاط دو کون را مجمع
ز فیض عشرت او بهره ور غنی و فقیر

کلیم کے ان اشعار سے تقریباً اس بات کا یقین ہو جاتا ہے که اس نے شاہ نواز خاں کے نئے محل کی مدح میں یه اشعار نظم کیے ہونگے ۔ ان سے یه بھی خیال ہوتا ہے که کلیم اس محل کے بننے کے قریب ہی

زمانے میں ہندوستان آیا ہوگا ۔ اس خیال کی صحت میں اسکے ورو
بیجاپور کی تاریخ ۱۰۰۸ - ۱۰۱۰ کے قریب ہوگی - بہر حال اتنا مسا
ھے کہ ۱۰۰۶ کے بعد ھی آیا، کیونکہ اسی سنہ میں شاہ نواز خاں
یہ لقب ملا تھا اور کلیم کے یہاں پہلی نظم میں یہ لقب موجود ھے
اس سلسلے میں چند باتوں کا تذکرہ ضروری ھے -

نظم گزیدہ کی رو سے کلیم کا قیام شیراز ''اوائل شعور،، اور بادش
نامہ کے اعتبار سے ''سر آغاز جوانی،، میں تھا اور وہاں سے وہ دکن آ
ھے - یہاں بقول صاحب نظم گذیدہ اس کا باقاعدہ نشوونما ہوا
کلیم کے دیوان میں ایک قطعہ ھے (۱) جو ۱۰۰۰ ھجری میں نظم ہوا
ظاہر ھے اس وقت وہ بیس سال سے کم نہ رہا ہوگا (کیونکہ امکان ۔
کہ کچھ نظمیں اس سے قبل کی بھی ہونگی) اس حساب سے ۱۰۰۸
۱۰۱۰ کے درمیان اسکی کم سے کم عمر ۲۸ اور تیس سال کے درمیا
ہوگی ۔ اگر شیراز کے قیام کی مدت ۸-۱۰ سال فرض کی جائے تو بھ
اس شہر کا ورود ۲۰ سال کی عمر میں ہوگا اور ۲۰-۲۸ سال ''اوائ
عمر،، اور ''دور سر آغاز جوانی،،میں شمار ہوگی غرض ان وجوہ
کلیم کی آمد بیجاپور ۱۰۱۰ ھجری کے بعد مشکل ھی سے فرض کی جاسکیگی

ظہوری نے سہ نثر کی نثر سوم میں شاہ نواز خاں شیرازی
محل کی بڑی تعریف کی ھے لیکن یہ محل بیجاپور کے بجائے نورسپ
میں تھا ۔ ظہوری کے الفاظ (۲) یہ ھیں :

''و شہنشاہ قدردان چنانش از خاک برگرفتہ کہ در نورسپ
از بام قصر و کاخش زمیں نشینان آسمان را دیدہ ۔ ایوانِ رف

---

(۱) ص ۸۵-
(۲) مطبوعہ ص ۵۴ -

بنیانش در حساب بلندی بپایهٔ که اگر بخار بحار مانع نمی‌بود اهل فارس از بام مسجد نو (۱) که هم بر آوردهٔ آنحضرت است کنگرهایش می شمردند و پیش طاقش نه پهنائی است که درازی سخن بصحن آن وفا کند۔ سایهٔ سنگینش اگر لنگر اندازد تختهٔ پشت گاوے زمیں را کشتی سازد :

رباعی

عالی همت بنای پستے نکند — این طرح بجز محیط دستے نکند
برخاسته اندگاوےماهی بفغان — سنگیست بنا زمین نشستے نکند

نورسپور کا یه محل ۱۰۰۸ هجری کے بعد هی بنا هوگا، اس لیے که یه نیا شهر خود شاه نواز خاں کی سرپرستی میں اس سنه کے بعد آباد هونا شروع هوا تها۔ خیال هوتا هے که نورسپور کا محل بیجاپور کے محل سے کچھ هی عرصه بعد تیار هوا هوگا۔ اس بنا پر اگر کلیم کے قصاید میں نورسپور کے محل کی تعریف مقصود هوگی تو بهی کلیم کے آمد بیجاپور کی تاریخ میں کوئی خاص فرق واقع نہیں هوتا۔

تفصیلات بالا سے اس بات کی پوری وضاحت هوگئی که کلیم شمالی هند کے بجاے اول اول دکن آیا اور بیجاپور میں شاه نواز خاں شیرازی سے منسلک هوگیا۔ اس کے ساتھ اختری یزدی بهی تها۔ جو بقول صاحب نظم گزیده مرزا محمد امین میر جملهٔ محمد قلی قطبشاه کا پرورده تها شاه نواز خاں مذکور مرزا رستم صفوی کے فرزند سے کوئی تعلق نہیں رکهتا اور چونکه آخرالذکر کی مدح سے کلیم کا دیوان

(۲) فرشته نے بهی لکها هے که شیراز کی مسجد نو کے لیے شاه نواز خاں نے ایک بڑی رقم بهیجی هے (تاریخ ج ۲ ص ۸۳)۔

بالکل خالی ہے اس بنا پر ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ در اصل کلیم اپنے قیام ہندوستان کے دور میں صفوی خاں سے متعلق نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ جب کلیم شاہ جہانی دربار کی ملک الشعرائی کے عہدہ پر فائز تھا تو شاہنواز خاں صفوی کا طوطی بول رہا تھا اور اسکی تین لڑکیاں شاہ جہاں کے تین شہزادوں یعنی شاہ شجاع ، اورنگ زیب اور مراد سے منسوب تھیں۔

اسی ضمن میں کلیم کی مرزا محمد امین میر جملہ سے وابستگی پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ متعدد بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیم شمالی ہندوستان میں مرزا سے متعلق ہوا ہے۔ پرتو بیضائی بھی خزانہ عامرہ اور شعر العجم کی پیروی میں مقدمہ دیوان کلیم میں لکھتے ہیں (۱) :

''دومین سفر (کلیم) در سال ۱۰۳۰ صورت گرفته و در این مرتبه با کسی مانند میر جملهٔ شهرستانی مصاحب و مربوط شده و شاید با اهتمام او جزو شعرای دربار جهانگیری منسلک و تا آخر عمر در هندوستان بسر می برد''

مگر یہ بات پوری طرح درست نہیں ۔ در اصل کلیم اپنے سفر اول میں مرزا محمد امین روح الامین(۲) سے گول کنڈہ میں ملا ہے۔ اس قیاس کے وجوہ یہ ہیں :

۱ - کلیم کے دوست ناظم تبریزی نے نظم گزیدہ (۳) میں لکھا ہے کہ شاہ نواز خاں کے مرنے کے بعد مرزا محمد امین شہرستانی سے

---

(۱) ص ه و۔
(۲) روح الدین تخلص تھا ۔
(۳) ورق ۱۸۶ ب ۔

گول کنڈہ میں ملا تھا۔ خارجی اور داخلی شہادتوں سے معلوم ہوتا (۱) ہے کہ مرزائے مذکور ۲۹ سال کی عمر میں ۱۰۱۰ ہجری میں اصفہان سے گول کنڈہ آیا اور محمد قلی قطب شاہ سے وابستہ ہوگیا اور ایک سال کے اندر میر جملہ کا معزز عہدہ اسکو تفویض ہوگیا چنانچہ بادشاہ کی وفات تک (۱۰۲۰ھ) سارے اقتدار کا مالک مرزا محمد امین ہی تھا ۔ لیکن محمد قلی کے جانشین محمد قطب شاہ سے اسکی نہ نبھ سکی چنانچہ ۱۰۲۱ ہجری میں وہاں سے نکل کر بیجاپور آیا ۔ یہاں کچھ دنوں رہا مگر مستقل طور پر قیام کی صورت غالباً نہ نکلی اس بنا پر وہ اصفہان چلا آیا۔ یہاں شاہ عباس صفوی کے ۲۸ویں سال جلوس یعنی ۱۰۲۳ میں دربار شاہی میں باریابی ہوئی ۔ ایران میں قدردانی کی توقع تھی مگر مرزا نے وہاں کا مستقل قیام مناسب نہ جانا اور ۱۰۲۷ ہجری میں دربار جہانگیری میں باریاب ہو کر معزز عہدے پر فائز ہوا۔ شاہ جہاں کے دور میں میر بخشی مقرر ہوا اور ۱۰۴۷ ہجری میں وفات پائی۔

اس سے ظاہر ہے کہ اگر سفر اول میں کلیم میرجملہ سے ملا تو ۱۰۲۰ ہجری کے قبل گول کنڈے میں ملا ہوگا ۔ اور اس اعتبار سے اس تاریخ سے قبل بیجاپور کو خیرباد کہا ہوگا ۔ اس سنہ میں شاہ نواز خاں شیرازی بقید حیات تھا اور اس بنا پر نظم گزیدہ اور نصرآبادی کا یہ قول درست نہیں معلوم ہوتا کہ شاہ نواز کے مرنے کے بعد ہی کلیم میرجملہ سے وابستہ ہوا ہے ۔ یوں تو ۱۰۲۱ میں میرجملہ بیجاپور میں مقیم رہا لیکن کلیم کی وہاں باقاعدہ وابستگی ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ مرزا محمد امین وہاں مستقل طور پر مقیم نہ تھا۔

(۱) ''نذر محمد قلی قطبشاہ'' (حیدر آباد ۱۹۵۷ء) میں راقم نے اس پر تھوڑی سی روشنی ڈالی ہے ۔

۲ - نظم گزیدہ ھی کی روایت کی بنا پر کلیم اختری یزدی کے ساتھ (۱) ۱۰۲۸ ھ میں ایران واپس گیا اور اختری محمد امین میرجملہ کا پروردہ تھا - اس سے خیال یہی ھوتا ھے کہ کلیم بھی گول کنڈہ میں میرجملہ کے خوان احسان سے بہرہ یاب تھا -

۳ - کلیم کے قصیدے میں مرزا محمد کے دیوان کا ذکر تفصیل سے ھے - مرزا کا زیادہ کلام قیام گول کنڈہ کی یادگار ھے اس بنا پر قیاس کیا جا سکتا ھے کہ کلیم نے انہیں ایام میں وہ نظم لکھی ھوگی -

ان اسباب کی بنا پر قرین قیاس یہی ھے کہ کلیم مرزا محمد امین سے دکن میں ملا ھوگا - لیکن اس سے اس بیان کی تردید نہیں ھوتی کہ وہ شمالی ھندوستان میں بھی میرجملہ سے ملا ھوگا - البتہ اس سلسلے میں ایک غیر واضح بات یہ ھے کہ ۱۰۲۱ کے بعد جب مرزا محمد امین ایران واپس چلا گیا ھے تو کلیم اور اختری ۱۰۲۷ تک کس سے اور کہاں وابستہ رھے - اس سلسلے میں یہ بات قابل توجہ ھے کہ ۱۰۲۵ ھجری میں ملک قمی ببجاپور میں فوت ھوا - چونکہ کلیم کا ایک قطعہ (۲) اس واقعہ سے متعلق ھے - اس بنا پر اسکی، اس موقع پر بیجاپور میں موجودگی بالکل ترین قیاس ھوگی - نظم گزیدہ میں رونقی ھمدانی (۳) کے متعلق یہ ھے :

”از اقران اختری و ابو طالب کلیم است و در ھند مدتی باھم بوده‌اند و در سنه ھزار و بیست و شش از ھند بعراق آمدند و ایشان را ملاقات کردم الحق که خالی از آدمیت نیستند -

سفینہ (۴) میں بھی رونقی کے ایران واپس ھونے کی تاریخ ۱۰۲۶ ملتی ھے - لیکن اگر اختری، کلیم اور رونقی ساتھ ساتھ عراق لوٹے ھیں

(۱) ورق ۱۸۶ ب وغیرہ -
(۲) ص ۷۷-۷۸ -
(۳) ورق ۹۴ -
(۴) بحوالۂ حواشی میخانہ مرتبہ پروفیسر محمد شفیع -

تو یہ تاریخ غلط ہے اس لیے کہ کلیم کے ایک صریحی قطعے کے علاوہ خود نظم گزیدہ کے حسب ذیل (۱) بیان سے واپسی کی تاریخ ۱۰۲۸ هجری واضح طور پر ثابت ہوتی ہے -

"کلیم در شاعری از اقران اختری یزدی و رونقی همدانی است. در سنه هزار و بیست و هشت بعراق معاودت نموده و در اصفهان فقیر بملاقات ایشان رسیده۔

یہی تاریخ نصرآبادی اور دوسرے تذکروں میں درج ہے - اگر رونقی کی واپسی کی تاریخ ۱۰۲۶ ھی فرض کی جائے تو پھر نظم گزیدہ اور میخانہ کے بیان میں تطبیق مشکل ہو جائے گی۔ مؤلف میخانہ کی ملاقات رونقی سے ۱۰۲۵ هجری میں اس وقت ہوئی جب وہ تازہ تازہ (۲) ایران سے آیا تھا۔ یہ تاریخ میخانہ کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں دی ہے مطبوعہ نسخے میں مقام ملاقات درج نہیں لیکن اس کے حاشیے اور علی گڑھ یونیورسٹی کے قلمی نسخے(۳) میں مقام ملاقات اجمیر بتائی گئی ہے - اگر اجمیر میں واقعی ملاقات ہوئی تو تاریخ ملاقات ۱۰۲۵ هجری قطعی غلط ہوگی اس لیے کہ مؤلف میخانہ ۱۰۲۳ میں اجمیر کو خیرباد کہہ چکا ہے اور اگر تاریخ ملاقات صحیح ہے تو اجمیر میں ملاقات نہوئی ہوگی۔ اس آخری صورت میں رونقی کے ۱۰۲۵ کے تازہ ورود کے ساتھ اگر ۱۰۲۶ میں اسکی ایران واپسی ہوگی تو اختری دور ملاقات نہوئی ہوگی۔ اس آخری صورت میں رونقی کے ۱۰۲۵ کے تازہ ورود کے ساتھ اگر ۱۰۲۶ میں، اسکی ایران واپسی ہو گئی تو اختری

۱- ورق ۱۸۶ ب -
۲- ورق ۳۷۷ ب -
۳- ورق ۳۶۸ و ۳۶۹ -

دور کلیم کے ساتھ اسکی مدتوں کی صحبت جو نظم گزیدہ میں
باطل ہو جاتی ہے اور اگر ۱۰۲۳ ہجری میں اس کا ورود ہند ق
کیا جائے پھر بھی ان تینوں کی صحت کی مدت زیادہ سے زیادہ دو
کی ہو سکتی ہے ، اس قلیل مدت کا ''مدتے،، کے لفظ سے یاد
شبہ سے خالی نہیں ۔ ان وجوہ کی بنا پر رونقی کی واپسی ایران کی تا
۱۰۲۶ کے بجاے ۱۰۲۸ بصورت موجودہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی
رونقی ہمدانی وہی شاعر ہے جس نے عرفی کی ہڈیوں کی منتقلی کی تا
اسطرح۱ نکالی تھی :

رقم زد از پی تاریخ رونقی کلیم
بکاوش مژہ از ہند۲ تا نجف آمد = ۱۰۲۷ھ

عرفی لاہور میں دفن تھا ۔ اس تاریخ سے قیاس ہو سکتا ہے
۱۰۲۷ میں، رونقی لاہور میں موجود ہوگا ۔ اور اس کے کلیم اور اخ
کے ساتھ ۱۰۲۸ میں اصفہان پہنچنے سے یہ قیاس کیا جا
ہے کہ اختری اور کلیم بھی ۱۰۲۷ کے قریب لاہور میں ہونگے
یہیں سے اپنے وطن لوٹے ہوں گے ۔

یہ ہے ایک گذارش کلیم کے ہندوستان کے پہلے سفر کی ۔ اگر
اس سلسلے کے بعض واقعات غیر واضح ہیں پھر بھی اس کی ا
سے بعض الجھی ہوئی باتیں صاف ہو جاتی ہیں ۔

۱- مثلاً ملاحظہ ہو نظم گزیدہ ورق ۱۱۳ ، خزانۂ عامرہ، ص ۳۱۹، شعرالع
ج ۳، ص ۸۲ -

۲- مگر شعرالعجم اور بعض دوسرے تذکروں میں لفظ ''ہند'' کے بجا
''گور'' آیا ہے جس کی بنا پر اصل تاریخ میں ۱۶۷ کا اضافہ ہو جاتا ہے
(نیز ملاحظہ ہو فہرست کتابخانۂ مدرسہ سپہسالار- تہران جلد ۲ ص ۹۰
بعض لوگوں نے ۱۰۲۷ کے بجاے ۱۰۲۸ تاریخ لگائی ہے' (ملاحظہ ہو فہرس
مذکور)

ڈاکٹر عبادت بریلوی

میرزا مظہر جان جاناںؒ

میر، سودا اور درد کے زمانے میں جو شاعر پیدا ہوئے ہیں ان میں سب سے پہلے میرزا مظہر جان جاناں پر نظر پڑتی ہے۔ وہ اس زمانے کے مشہور شاعر ہیں۔ ہرچند کے انہوں نے شاعری کی طرف پوری طرح توجہ نہیں کی۔ ان کی درویشی شاعری کی راہوں میں حائل رہی۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے اور تصوف سے انہیں اس حد تک لگاؤ تھا کہ وہ اس کے سامنے زندگی کے کسی اور پہلو کو اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ انہیں فارسی کے ساتھ زندگی بھر گہری وابستگی رہی اور انہوں نے فارسی شعر کہنے میں اپنا خاصا وقت صرف کیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اردو شاعری کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور اس زبان میں بڑی اعلیٰ درجے کی شاعری کی۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اردو میں ایسا کچھ زیادہ سرمایہ نہیں چھوڑا ہے۔ سودا، میر درد، اور میر تقی میر کے مقابلے میں تو، جہاں تک مقدار کا تعلق ہے اُن کی شاعری مقدار میں بہت ہی کم ہے، لیکن جو اشعار ان کے ادھر ادھر بکھرے ہوئے ملتے ہیں ان سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو کے بھی اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ اور اگر انہیں موقع ملتا تو وہ میر، سودا اور درد ہی کی طرح بہت سا سرمایہ چھوڑ سکتے تھے۔ لیکن ان کی اہمیت اس لئے کم نہیں ہوتی کہ ان کے اردو اشعار میں وہ رجحانات پوری طرح ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں جن کی وجہ سے یہ دور مشہور ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ایہام گوئی

سے پوری طرح علیحدگی اختیار کی ھے۔ اور اردو شاعری کو صحیح بنیادوں پر قائم کیا ھے۔ انھوں نے تغزل کے اعلیٰ معیار قائم کئے ھیں انھوں نے عشق کا ایک اعلیٰ وارفع تصور پیش کیا ھے۔ بلند واردات وکیفیات کی ترجمانی کی ھے۔ حقیقت و معرفت کا رحجان بھی ان کے اشعار میں ملتا ھے۔ تصوف کے معاملات و مسائل کی عکاسی بھی ان میں نظر آتی ھے۔ فنی اعتبار سے بھی وہ ایک بلند مرتبہ رکھتے ھیں ۔ ان میں سادگی کا حسن سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتا ھے۔ فارسی کی روایت سے صحیح استفادے نے ان میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی ھے۔ زبان کو انھوں نے ایک فن بنایا ھے۔ اس کی تراش خراش کی طرف انھوں نے باقاعدہ توجہ کی ھے۔ اسی لئے ان کے اشعار میں جو زبان ملتی ھے وہ منجھی منجھائی اور دُھلی دھلائی نظر آتی ھے—— غرض یہ کہ میرزا مظہر جان جاناں نے اردو شاعری کو ترقی کے راستے پر گام‌زن کرنے میں نمایاں کام کیا ھے۔

میرزا مظہر جان جاناں اپنے ھم عصر شعراء میر درد، میرزا سوداء اور میر تقی میر میں سب سے بڑے تھے۔ انکی ولادت ۱۱۱۱ھ یا ۱۱۱۳ھ میں ھوئی۔ سودا ۱۱۲۵ھ میں، خواجہ مِیر درد ۱۱۳۱ھ میں اور میر ۱۱۳۷ھ میں پیدا ھوئے۔ ان تاریخوں سے پتہ چلتا ھے کہ ان سب شعراء میں مرزا مظہر کو بزرگی کا مرتبہ حاصل تھا۔ یہی سبب ھے کہ بعض لکھنے والے انھیں اس دور سے قبل کے دور میں شامل کر لیتے ھیں۔ لیکن ان کے کام کو سامنے رکھاجائے تو وہ صحیح معنوں میں میر، سوداء اور درد کے ھمعصر معلوم ھوتے ھیں ۔ کیونکہ ان کا مزاج انھیں شعراء کے مزاج سے مناسبت رکھتا ھے اور وہ اس کام

میں برابر کے شریک ہیں، جس کا آغاز ان شاعروں کے ہاتھوں ہوا اور جس میں وہ ساری زندگی پیش پیش رہے۔

آزاد نے صحیح لکھا ہے کہ ''لطافت مزاج اور نزاکت طبع کا نتیجہ ہے کہ زبان کی طرف توجہ کی اور اسے ایسا تراشا کہ جو شعراء پہلے گذرے تھے انہیں پیچھے چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کر دیا اور اہل زبان کو نیا نمونہ تراش کر دیا، جس سے پرانا رستہ ایہام گوئی کا زمین شعر سے مٹ گیا۔ ان کے کلام میں مضامین عاشقانہ عجب تڑپ دکھاتے ہیں اور یہ مقام تعجب نہیں۔ کیونکہ قدرتی عاشق مزاج تھے۔ اوروں کے کلام میں یہ مضامین خیالی ہیں ان کے اصل حال (۱)''

اور یہ حقیقت ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں اس عہد کے بڑے ہی اہم شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت کو اس کام میں اولیت کا شرف حاصل ہے جو اس دور میں مختلف شعراء کے ہاتھوں ہوا۔ قدرت نے اپنے تذکرے (تالیف ۱۱۸۸ھ) میں مظہر جان جاناں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

''میگویند کہ اول کسے کہ طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوے معلیٰ شاھجہاں‌آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص گردید مُروّج ساختہ زبدۃالعارفین قدوۃالواصلین واقف رموز جناب اکبر کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا مظہر جان جاناں متخلص بہ مظہر مردیست فرشتہ صفت، علوی نسب، حنفی مذہب، نقشبندی مشرب (۲)''

۱- آزاد : آب حیات، ص ۲۵۱ -
۲- قدرت : طبقات الشعراء

اور یہ خیال اپنی جگہ پر صحیح ہے اس دور میں جو کام انہوں نے اردو شاعری کے لیے کیا ہے وہ اس خیال پر صداقت کی مہر لگاتا ہے۔

ان کا اصل نام جان جاں، لقب شمس الدین حبیب اللہ اور تخلص مظہر تھا ۔ ان کے نام کے بارے میں اختلافات ہیں ۔ میر نے نکات الشعراء میں لکھا ہے

''پدر او مرزا جان نام داشت۔ از فرط شفقت مرزا جان جاں
می گفت۔ ازیں سبب بہ ہمیں اسم موسوم است (۱)''

لیکن وہ عام طور پر مرزا جان جاناں کے نام سے مشہور ہیں۔ آزاد کے قول کے مطابق ان کا نام جان جاں اورنگ زیب عالمگیر نے رکھا تھا ان کے والد مرزا جان کے نام سے مشہور تھے۔ اسی نسبت سے اورنگ زیب نے ان کا نام جان جاں رکھا ۔ لوگوں نے بڑھا کر جان جاناں کر دیا ۔ یہ تبدیلی خود مرزا صاحب کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مکاتیب میں ہر جگہ اپنا نام جان جاناں ہی لکھا ہے۔ مجمع النفائس مرزا مظہر کے زمانے ہی میں لکھی گئی ہے۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ ''حالا بہ جان جاناں شہرت گرفتہ'' ــــ آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں لکھا ہے ''لیکن نام او بر السنہ، مرزا جان جاناں جاری شدہ''۔ غرض یہ کہ وہ عام طور پر جان جاناں ہی کے نام سے مشہور ہیں۔ اور یہ نام ان کی زندگی ہی میں مشہور ہوگیا تھا ۔ ان کا سلسلہ نسب ۲۸ واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ مرزا مظہر کے والد مرزا جان ایک

۱- میر: نکات الشعراء، ص ۵ -

صوفی بزرگ تھے ۔ والدہ بیجاپور کے شاہی خاندان سے تھیں ۔ اس خاندان میں مرزا مظہر ۱۱ رمضان کو پیدا ہوے ۔ ان کا سال ولادت عام طور پر تذکروں میں ۱۱۱۱ھ ملتا ہے ۔ معمولات مظہریہ اور مقامات مظہری دو کتابیں خاص مرزا صاحب کے حالات میں لکھی گئی ہیں۔ صاحب معمولات نے ۱۱۱۱ھ اور صاحب مقامات نے ۱۱۱۱ھ یا ۱۱۱۳ھ سال ولادت لکھا ہے : لیکن مرزا صاحب کے بیانات نے تاریخ ولادت میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کو سرو آزاد کے لیے اپنے حالات لکھکر بھیجے ہیں اس میں لکھا ہے۔ ''....در عشرۂ اولیٰ مائۃ ثانیہ بعد الف ولادتش (ولادت مرزا صاحب اتفاق افتاد،،)۔ اس بیان کے مطابق ان کا سنہ ولادت ۱۱۱۰ھ سے پہلے ہونا چاہیے ۔ اپنے فارسی دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں : ''امروز ہزار و صد و ہفتاد ہجری است و عمر بشصت رسیدہ،، اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو ان کا سال ولادت ۱۱۱۰ھ اور ۱۱۱۱ھ کے مابین قرار پاتا ہے ۔ اپنے ایک مرید کے اصرار پر مرزا صاحب نے اپنے حالات لکھے ہیں۔ اس میں اپنا سال پیدائش ۱۱۱۳ھ لکھا ہے ۔ لکھتے ہیں: ''در ہزار و صد و سیزدہ ولادت فقیر اتفاق افتاد،، — بہر حال مرزا صاحب کا بیان تاریخ ولادت میں اختلاف کو پیدا کرتا ہے — ان تمام بیانات کو سامنے رکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ۱۱۱۱ھ یا ۱۱۱۳ھ میں پیدا ہوے ہونگے ۔ مرزا مظہر کا وطن آگرہ ہے ۔ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ آگرے ہی میں گذرا ۔ تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی ، لیکن مرزا مظہر نے دلی کو اپنا مسکن بنا لیا اور آخر دم تک یہیں رہے ۔ ان کی تعلیم اعلیٰ پیمانے پر ہوئی ۔ انہوں نے فارسی اپنے والد سے پڑھی۔

قرآن مجید عبدالرسول صاحب دهلوی سے پڑھا ۔ حدیث، تفسیر اور دوسری کتابیں شیخ محمد افضل صاحب سیالکوٹی سے پڑھیں۔ اس طرح انہیں مختلف علوم کے مطالعے کا موقع ملا اور انہوں نے ہر فن اور علم میں مہارت حاصل کی۔ خزینۃالاصفیا میں لکھا ہے کہ ''از ہر فن و علم ظاہری بہرۂ کامل حاصل نمود،، ۔ ان علوم کے علاوہ انہوں نے سپہ گری کا فن بھی سیکھا اور ان کاموں میں بھی مہارت حاصل کی۔ مرزا مظہر کے والد کا انتقال ۱۱۳۰ھ میں ہوا ۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھی ۔ اس وقت انہوں نے دربار شاہی سے منسلک ہونا چاہا، لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا ۔ ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک بزرگ کے مزار پر گئے ہیں ۔ وہ اپنی قبر سے باہر آئے ہیں اور انہوں نے اپنی ٹوپی مرزا مظہر کو پنہا دی ہے۔ اس خواب کا اثر ان پر اتنا گہرا ہوا کہ انہوں نے دنیا کو ترک کر دیا، اور درویشی اختیار کی۔ سب سے پہلے وہ حضرت سید محمد نور بدایونی کے مرید ہوے ۔ اس کے بعد شاہ گلشن ، حافظ سعداللہ اور حضرت شیخ محمد عابد سنامی سے فیض حاصل کیا ۔ اور اس طرح تیس سال کی عمر تک پہنچتے خود ایک صاحب کمال بزرگ ہو گئے ، اور اپنا سارا وقت مریدوں کے لیے وقف کر دیا ۔ اس سلسلے میں وہ دھلی کے آس پاس کے علاقوں میں بھی جاتے رہے۔ اس کی تفصیل انہوں نے اپنے مکاتیب میں لکھی ہے ۔ ان مصروفیات نے انہیں شعر و شاعری کی طرف پوری طرح توجہ نہیں کرنے دی۔ کبھی کبھی فرصت ملتی تھی تو شعر کہہ لیتے تھے ۔ اسی لیے اردو میں ان کا دیوان مرتب نہ ہو سکا۔ فارسی کا ایک دیوان البتہ موجود ہے ۔ مرزا مظہر جان جاناں کا انتقال ۱۱۹۵ھ محرم کی دسویں تاریخ کو ہوا۔

ساتویں محرم کو ایک شخص مکان پر آیا، آواز دی۔ مرزا جان جاناں باہر نکلے۔ اس نے قرابین سے حملہ کیا۔ لہو لہان ہوگئے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ انہوں نے محرم کی عزاداری پر کچھ اعتراضات کئے تھے۔ یہ بات کچھ لوگوں کو بری معلوم ہوئی۔ ان کے قتل کا اصل سبب یہی تھا۔

میرزا مظہر جان جاناں بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ سچائی اور صاف گوئی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے اور سوچتے تھے اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ ان کی علمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ انہوں نے ظاہری اور باطنی علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ دنیا اور دین، مجاز اور حقیقت دونوں کے اسرار و رموز ان کے سامنے بےنقاب تھے۔ گفتگو کرنے میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ بات کرتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ میر صاحب نے لکھا ہے کہ ''خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر نمی گنجد''۔ وہ ایک بڑے انسان دوست تھے۔ انسانی معاملات و مسائل سے انہیں گہری دلچسپی تھی اور زندگی کے تمام نشیب و فراز کو سمجھتے تھے۔ ان کے پاس زندگی کی بعض قدریں تھیں جن کو انہوں نے زندگی بھر عزیز رکھا۔ وہ کبھی کسی کے دربار میں نہیں گئے۔ کبھی کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ دنیا کے ہنگاموں سے انہیں نفرت تھی۔ اسی لیے وہ ساری زندگی گوشہ‌نشین رہے اور دنیا کے ہنگاموں میں اپنے آپ کو نہیں پھنسایا۔ یاد الٰہی اور خدمت خلق کو انہوں نے اپنا نصب‌العین بنایا اور انہیں کاموں میں اپنی زندگی گذار دی۔ انہوں نے شاعری کی طرف پیشہ‌ور شاعروں کی طرح توجہ نہیں کی۔

کبھی کچھ محسوس کیا تو کہہ لیا۔ دل پر جو کچھ بیتی اس کی ترجمانی کردی۔ اسی لیے انکا شعری سرمایہ بہت کم ہے۔ لیکن جو اشعار ان کے ادھر ادھر بکھرے ہوئے ملتے ھیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ انہوں نے اچھی شاعری کی تخلیق ھی نہیں کی تھی، اچھی شاعری کا ماحول بھی پیدا کیا تھا۔

وہ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔ ان کا ایک مختصر فارسی دیوان موجود ہے۔ اردو میں کبھی کبھی شاعری کی، لیکن دیوان مرتب نہ ہوسکا۔ مختلف تذکروں میں ان کے اشعار بکھرے ہوئے ملتے ھیں۔ مولانا عبدالحی نے ''گل رعنا،، میں ان اشعار کو یک جا کر دیا ہے۔ حال ھی میں عبدالرزاق قریشی صاحب نے ''نوائے ادب،، بمبئی میں مرزا مظہر کے بہت سے غیر مطبوعہ اشعار شائع کیے ھیں۔ ان اشعار کی تعداد خاصی ہے، لیکن ان میں سے بعض کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ میرزا مظہر جان جاناں کے اشعار ھیں۔ بہر حال ان کے جو اشعار جگہ جگہ بکھرے ہوئے ملتے ھیں ان سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ ان کی شاعری کی فنی اور لسانی حیثیت کیا ہے اور اردو شاعری کی روایت میں اس نے کیا اضافے کیے ھیں۔

میرزا مظہر جان جاناں کی شاعری میں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کی معنویت ہے۔ ان کے اشعار کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بنیاد کوئی خاص صنعت نہیں ہے۔ وہ صرف قافیہ پیمائی کی غرض ھی سے نہیں کہے گئے ھیں۔ زبان و بیان ھی ان کی بنیاد نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ان اشعار میں موضوع اور مواد کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ خیال ھی ان کا

محور ہے، جس کے گرد وہ گھومتے ہیں ۔ مرزا مظہر نے جو کچھ دیکھا ہے، جو کچھ محسوس کیا ہے، جو کچھ سوچا ہے، ان سب کی تصویریں ان اشعار میں ملتی ہیں ۔ ان کے جذبات اور افکار و خیالات ان اشعار میں بےنقاب نظر آتے ہیں ۔ موضوعات کا ان میں خاصا تنوع ہے، ان میں مجازی اور حقیقی تصورات عشق کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی بھی موجود ہے اور ساتھ ہی حیات و کائنات کے دوسرے معاملات و مسائل کی طرف بھی جگہ جگہ اشارے ملتے ہیں۔ مرزا مظہر نے ان تمام پہلوؤں پر مختلف زاویوں سے مختلف انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

عشقیہ موضوعات پر جن اشعار کی تخلیق انہوں نے کی ہے ان میں واردات و کیفیات کا اظہار زیادہ ہے ۔ اس عالم میں انسان پر جو کچھ گزرتی ہے، جن حالات سے وہ دوچار ہوتا ہے، ان میں سے بیشتر کو مرزا مظہر نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے ۔ محبوب کے بارے میں ان کے یہاں بعض اشعار ملتے ہیں، جن میں اس کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے، لیکن وہ ایسے مواقع پر صرف اس کے حسن کی تعریف ہی نہیں کرتے، بلکہ اس کی سیرت کی تصویرکشی کرتے ہیں، اور اس شخصیت کے ہاتھوں محبت کرنے والے پر جو عالم طاری ہوتا ہے اس کے مختلف پہلوؤں کو ان اشعار میں پیش کرتے ہیں ۔ یہ اشعار اسی صورت حال کے ترجمان ہیں :

حنا تیرے کف پا کو نہ اس شوخی سے سہلاتی
یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انھوں کی نیند کیوں جاتی

زخمی تری نگه کا اک پل جیا تو پھر کیا
صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

کسی کے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن
نہایت منہ لگایا ہے سجن نے بیڑۂ پان کو

آج مت رنگ حنا سے کف پا لال کرو
اے بتاں اس دل پر خون کو پامال کرو

یہاں میرزا مظہر جان جاناں نے صرف حسن کو دیکھکر اس کی تعریف ھی نہیں کی ہے ۔ بر خلاف اس کے انھوں نے اس حسن سے گہرا تأثر قبول کیا ہے ۔ اسی لیے حنا جب محبوب کے کف پا کو سہلاتی ہے تو عاشق کی آنکھیں لہو روتی ھیں اور انکی نیند اڑ جاتی ہے ۔ نگاہ یار کے ھاتھوں زخم کاری لگتا ہے ۔ محبوب بیڑہ پان کو منہ کیا لگاتا ہے عاشق کی جان کے لالے پڑ جاتے ھیں اور رنگ حنا کا حسن دل پر خون کو پامال کرتا ہے ۔ غرض یہ مضامین اس حقیقت کو واضح کرتے ھیں کہ میرزا مظہر کیفیات کے شاعر ھیں ۔ وہ خارجی حسن کا بیان نہیں کرتے ۔ ان کے یہاں حسن کا کوئی مجرد تصور نہیں ہے، اسی لیے ان کے اشعار میں ایسے مضامین کی فراوانی نظر آتی ہے، جس میں محبت کرنے والے کی عام حالت کا بیان ھوتا ہے ۔ اس موضوع پر کیسے عجیب عجیب اشعار انھوں نے کہے ھیں ۔

الٰہی مت کسو کے پیش رنج انتظار آوے
ہمارا دیکھیے کیا حال ھو جب تک بہار آوے

آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلہ کہو
مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

مت اختلاط کر اے نو بہار تو ہم سے
چمن میں ہونے اس خاک کو دماغ نہیں

جوتو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہربان اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دل‌زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

لوگ کہتے ہیں موا مظہر بےکس افسوس
کیا ہوا اوس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

نہیں کچھ غم کہ کیوں ملتا نہیں پیمان گسل میرا
کہ میں روتا ہوں دل کی بےکسی پر ہائے دل میرا

جواں مارا گیا خوباں کے اوپر میرزا مظہر
بھلا تھا یا برا تھا زور کچھ تھا خوب کام آیا

الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم‌تر سے مینہ نہ برساتی

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

اودھر نگہ کی تیغ ادھر آہ کی سناں
اس کشمکش میں عمر ہماری بھی کٹ گئی

برگ حنا اوپر لکھو احوال دل مرا
شاید کبھی تو جا کے لگے دل‌ربا کے ہاتھ

ان اشعار میں رنج انتظار کے پیش آنے، دل کے شرارہ اور کوئلا ہو جانے، محبوب کے نامہربان ہو جانے، عاشق کے بیمار ہو کر فنا ہو جانے وغیرہ کا جو تذکرہ ہے ان کا تعلق ظاہر ہے کہ واردات و کیفیات عشق سے ہے۔ میرزا مظہر نے ان کیفیات کو حقیقت و واقعیت کا رنگ دے کر پیش کیا ہے ۔ اسی لیے یہ اشعار دل پر اثر کرتے ہیں ۔ ان میں صداقت کا پتہ چلتا ہے ۔ خلوص کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے ۔ یہ باتیں نئی نہیں ہیں ۔ غزل کی روایت میں ان کو پیش کیا جاتا رہا ہے لیکن یہاں خلوص اور صداقت نے میرزا مظہر کے ایسے اشعار میں ایک نئی بات پیدا کر دی ہے ۔ اور ان میں ایک اچھوتا پن آ گیا ہے ۔ یہی اچھوتا پن ان کے ایسے اشعار کی جان ہے ۔

تصوف سے گہری وابستگی نے میرزا مظہر کے کلام میں وسعتیں بھی پیدا کی ہیں۔ ان کے عشقیہ اشعار کی معنویت کو بھی محدود نہیں کیا جا سکتا ۔ ان میں بظاہر تو مجازی عشق کا بیان ہے، لیکن سننے والا ان میں حقیقت کی آواز بھی سن سکتا ہے ۔ معرفت کے خیالات اس کو مجاز کے روپ میں بےنقاب نظر آ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے میرزا مظہر کی عشقیہ شاعری خاصی پہلودار شاعری ہے ۔ اس میں خاصی ہمہ‌گیری

کا پتہ چلتا ہے ۔ ان اشعار کی معنویت معرفت و حقیقت سے تعلق رکھتی ہے :

تجلی گر تری پست و بلند آن کو نہ دکھلاتی
فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے
مینا لگا ہے جب سے کہ مجھ بے نوا کے ہاتھ

مرتا ہوں میرزائی گُل دیکھ ہر سحر
سورج کے ہاتھ چنوری تو پنکھا صبا کے ہاتھ

مظہر چھپا کے رکھ دل نازک کو اپنے تو
یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ ۔

وقت ہے ماہ رو کے آنے کا
فکر کر شمع کے بجھانے کا

گذر گئے دین اور دنیا سے تس پر
ترا گھر اور کئی منزل رہا ہے

غنیمت جان قاتل ! جان مظہر
یہ مقتولوں میں ٹک بسمل رہا ہے

یہاں تغزل کی کمی کا احساس نہیں ہوتا ۔ یہ شعر صحیح معنوں میں غزل کے شعر معلوم ہوتے ہیں ، لیکن ان میں معنوی وسعت پائی جاتی ہے ۔ یہاں محبوب کی تجلی ذات باری کی تجلی ہے ، جس نے زمین و آسمان

کو پست و بلند دکھایا ہے اور جس کی وجہ سے فلک گھومتا ہے اور زمین فرش ہو گئی ہے ۔ مینا در حقیقت، معرفت کی مینا ہے جو کسی کے ہاتھ لگ جائے تو وہ دو عالم کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ میرزائی گل در حقیقت ذات باری کے حسن کی جلوہ گری ہے ۔ غرض ان اشعار میں میرزا مظہر نے تصوف کے بعض پہلوؤں کو پیش کیا ہے ، لیکن غزل کا مخصوص انداز اور آہنگ ان میں پایا جاتا ہے ۔

میرزا مظہر کے کلام میں مفکرانہ گہرائی کم ہے ۔ غور و فکر سے زیادہ ان کے یہاں محسوسات کا پلہ بھاری نظر آتا ہے ۔ اسی لیے وہ حیات و کائنات کے مختلف مسائل فلسفیانہ انداز میں پیش نہیں کرتے ۔ ان کے کلام میں ان معاملات و مسائل کا ذکر محض برائے نام ہے ۔ پھر بھی وہ انسانی زندگی کی بعض بنیادی حقیقتوں کا شعور رکھتے ہیں ۔ کہیں کہیں ان کے اشعار میں ان حقائق کی ترجمانی بھی ملتی ہے :

اتنی فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

توفیق دے کہ شور سے اک دم یہ چپ رہے
آخر یہ میرا دل ہے الٰہی جرس نہیں

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

لالہ وُ گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

شاخ گل ہلتی نہیں پر بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر
فی‌الحقیقت میں گھر گیا مظہر

یہ اشعار درحقیقت ان خیالات کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں کہ زندگی بےثبات ہے ۔ یہاں فرصت زندگی انسان کو میسر نہیں ۔ مدتوں انسان اس باغ دنیا میں رہتا ہے، لیکن اس کو دم لینے کی مہلت نہیں ملتی ۔ اس زندگی میں قدم قدم پر انتشار اور ہنگاموں کی حکمرانی ہے ۔ یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے ۔ زندگی میں انسان ہر چیز کو اپنی چیز سمجھتا ہے۔ لیکن کوئی چیز بھی اس کی نہیں ۔ وہ تہی‌دست ہے ۔ یہاں بہاریں یوں ہی رخصت ہو جاتی ہیں ۔ انسان ان بہاروں سے محظوظ ہونا چاہتا ہے، لیکن اس کو محظوظ ہونا نصیب نہیں ہوتا ۔ بس ہمیشہ ایک حسرت انسان کے دم کے ساتھ رہتی ہے ۔ فنا ہو جانا اس زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے ، لیکن انسان کو فنا ہو جانے کے بعد بھی چین نصیب نہیں ہوتا : حالانکہ موت بہت سے الجھے ہوئے مسائل کا حل ہے۔ مرنے کے بعد انسان درحقیقت اپنے اصل مسکن کی طرف جاتا ہے ۔ غرض کچھ اس طرح کے خیالات ہیں جو

مرزا مظہر کے کلام میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے ملتے ہیں ۔ ان میں فلسفیانہ آہنگ اور مفکرانہ انداز نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک ایسے صوفی کے خیالات ہیں، جس نے ان کو صرف محسوس کیا ہے ۔ ان پر غور و فکر کرنے کی طرف جس نے توجہ نہیں کی ہے، لیکن اس صورت حال نے ایسے اشعار میں ایک خوبی ضرور پیدا کر دی ہے اور وہ خوبی یہ ہے کہ وہ غزل کے سانچے میں ڈھلے ڈھلائے معلوم ہوتے ہیں ۔ ان میں غزل کی روایت پوری طرح اپنے آپ کو رونما کرتی ہے ۔

مظہر کے کلام کی بنیاد داخلیت پر استوار ہے ۔ اسی لیے اس میں اس سوز و گداز کی فراوانی ہے جس کے بغیر غزل کی صنف کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کے کلام کو دیکھکر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل کے مزاج کو پوری طرح سمجھتے ہیں ۔ وہ لوازم اور عناصر جن سے غزل صحیح معنوں میں غزل بنتی ہے ان میں سے ایک ایک کی اہمیت کا وہ شعور رکھتے ہیں ۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں ان عناصر اور لوازم سے خاطرخواہ کام لینے کا میلان خاصا نمایاں نظر آتا ہے ۔ ان کے کلام کی نوعیت داخلی ہے ، اسی لیے اس میں ایک غنائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے ۔ وہ غزل کی علامتوں اور اس کے اشاروں سے پوری طرح کام لیتے ہیں ۔ اپنے جذبات و احساسات اور افکار و خیالات کو انہیں علامتوں اور اشاروں کے سہارے پیش کرتے ہیں ۔ الفاظ کی مخصوص در و بست سے غزل کی صنف میں جو گل کاریاں ہوتی ہیں ، وہ گل کاریاں اپنی غزلوں میں مرزا مظہر جان جاناں نے بھی کی ہیں اور اس سلسلے میں فارسی الفاظ کے استعمال سے انھوں نے بڑا کام لیا ہے ۔ غزل ہندی الفاظ کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی ۔ اس حقیقت کو

سمجھ کر مرزا مظہر جانِ جاناں نے اپنی غزلوں میں ہندی الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے ۔ حالانکہ اردو غزل کی جو روایت ان تک پہنچی تھی اس میں ہندی کا اثر موجود تھا ۔ ایہام گوئی کی تحریک کے زیرِ اثر جن شاعروں نے غزلیں کہیں ، ان کے یہاں ہندی کے الفاظ خاصی تعداد میں موجود تھے ۔ مرزا مظہر نے اس سے دامن بچایا اور اپنی غزلوں میں فارسی کے اثرات سے خاطر خواہ کام لینے کی کوشش کی ۔ ان کے یہ اشعار غزل کی روایت کی صحیح تصویریں پیش کرتے ھیں :

گئی آخر جلا کر گل کے ھاتھوں آشیاں اپنا
نہ چھوڑا ھائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ھوتا گل اپنا، گلبن اپنا، باغباں اپنا

جنوں سوں اس قدر روئیں کہ رسوا ھو گئیں آخر
ڈبایا ھائے ان آنکھوں میں آخر خانماں اپنا

قفس کے بیچ کیا حسرت ستی بلبل یہ کہتی تھی
کہ پھر بھی دیکھنا قسمت ھوئے گا بوستاں اپنا

یہ بلبل بے اجازت باغباں کے گل سیں ملتی ھے
مجھے معلوم ھوتا ھے کہ جی دے گی ندھان اپنا

کہیں دینے سیں جی کے وصل ھونا ھات لگتا ھے
دیا برباد پروانے نیں نا حق دودماں اپنا

مرا جلتا ھے دل اس بلبل بےکس کی غربت پر
کہ گل کے آسرے پر جس نے چھوڑا آشیاں اپنا

یہ کہ کے باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت!
لکھا یوں تھا کہ چھوڑے فصل گل میں آشیاں اپنا

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشق بدگماں اپنا

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھکو جو ہم مہرباں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن ایسے کوں اے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جان جاں اپنا

بہار آنے سے بلبل نے بگاڑا ہے مزاج اپنا
سماتی نہیں ہے پھولوں میں مگر پائی ہے راج اپنا

بہار آئی کھلائے باغ، بلبل پھول کر بیٹھی
دوانوں کو کہو اس وقت کر لیویں علاج اپنا

گلوں کے فرش پر مت بیٹھ، چونڈے کو بھلا بلبل
خزاں کے آونے کی ہے خبر رکھ سر سے تاج اپنا

زخمی تری نگہ کا اک پل جیا تو پھر کیا
صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

وقت ہے ماہ‌رو کے آنے کا
فکر کر شمع کے بجھانے کا

جواں مارا گیا خوباں کے اوپر میرزا مظہر
بھلا تھا یا برا تھا زور کچھ تھا، خوب کام آیا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار

نرگس و گل کی دکھو کلیاں کھلی جاتی ہیں سب
پھر ان خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

شاخ گل ہلتی نہیں پر بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

اب کوئی ساعت میں آ صیاد کرتا ہے ملول
ایک دم کوں بلبلو! کیوں بیٹھتے ہو پھول پھول

اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو لیں اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

گر گل کو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں
بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

مت اختلاط کر اے نوبہار تو ہم سے
چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

بھولے ہیں گل چمن میں صنم کا جمال دیکھ
لالہ بہ دل ہے داغ ترے مکھ کا خال دیکھ

بلبل فدا ہوئی ہے ترے رخ پہ اے صنم
سنبل ہے پیچ پیچ تری زلف و بال دیکھ

کیا جواں مارا گیا خوباں کے ہاتھ
لاکھ حسرت کھیت آئیں جس کے ساتھ

کبھی اس دل نے آزادی نہ جانی
یہ بلبل تھا قفس کا آشیانی

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ
اس واسطے پڑا ہوں چمن میں ہوا کے ہاتھ

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے
مینا لگا ہے جب سے کہ مجھ بے نوا کے ہاتھ

برگ حنا اوپر لکھو احوال دل مرا
شاید کبھی تو جا کے لگے دل ربا کے ہاتھ

قاتل کو دیکھ بھیڑ گلی کے سمٹ گئی
یہ راہ چھاتیوں کے کواڑوں سے پٹ گئی
اودھر نگہ کی تیغ ادھر آہ کی سناں
اس کشمکش میں عمر ہماری بھی کٹ گئی

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں ہم کو دماغ و دل رہا ہے
نہیں آتا کسی تکیے اوپر خواب
یہ سر پاوں سے تیرے ھل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
گزر گئے دین اور دنیا سے نس پر
ترا گھر اور کئی منزل رہا ہے
غنمت جان قاتل جان مظہر
یہ مقتولوں میں ٹک بسمل رہا ہے

اگر ملئے تو خفت ہے وگر دوری قیامت ہے
غرض نازک دماغوں کو محبت سخت آفت ہے
کوئی لیوے دل اپنے کی خبر یا دلبر اپنے کی
کسی کا یار جب عاشق کہیں ہو کیا قیامت ہے

برچھی کو پکڑ ہاتھ میں آتے ہو اکیلے
کیا راج بہادر ہو سجن روپ نگر کے

رات کو یوں گھر بسا مجھ بر نہیں وہ گلبدن

ماہ جس کے باغ میں یک چاندنی کا پھول ہے

میرزا مظہر جان جاناں کے کلام کا یہ طویل اقتباس صرف اس خیال سے پیش کیا گیا ہے کہ اس سے ان کے کلام کی فنی خصوصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے صنف غزل کے مقتضیات کو کس حد تک پورا کیا ہے ۔ ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ میرزا مظہر کے فن کی بنیادیں داخلیت پر استوار ہیں ۔ اسی لیے ان کے کلام میں ایک غنائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے ۔ ان اشعار کا آہنگ نہایت ہی دھیما ہے ۔ ان میں آہستہ روی ہے ۔ ایک ہلکا ہلکا سا ترنم ہے ۔ مرزا مظہر نے یہاں غزل کے مخصوص اشاروں اور کنایوں سے بھی بڑا کام لیا ہے ۔ ان کے کلام کا زیادہ حصہ گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی علامتوں سے بھرا ہوا ہے اور ان علامتوں اور اشاروں کو انھوں نے بغیر کسی مقصد کے استعمال نہیں کیا ہے ۔ بلکہ ان سے اظہار و ابلاغ کے سلسلے میں بڑے کام لیے ہیں ۔ ان سے ایک طرف تو جذبات و احساسات کی صحیح تصویرکشی میں انھیں مدد ملی ہے دوسری طرف اظہار میں حسن بھی پیدا ہو گیا ہے ۔ نہ صرف یہ بلکہ صحیح اور مکمل اظہار کے لیے مظہر نے نئی علامتوں اور نئے اشاروں کی تخلیق بھی کی ہے ۔ اور اس طرح غزل کی صنف کو بعض نئے پیکروں اور نئی تصویروں سے بھی آشنا کیا ہے ۔ اسی لیے ان کے کلام میں بعض جگہ بالکل نئی امیجری ملتی ہے ۔ تشبیہات و استعارات سے بھی انھوں نے اپنے کلام کو سجایا ہے اور ان سے اظہار و ابلاغ میں بھی مدد لی ہے ۔ ان کے تخیل نے نئی نئی تشبیہوں کو تراش کر کلام میں

عجب گل کاریاں کی ھیں اور یہ سب کچھ فارسی کی شعری روایت کے گھرے اثرات کا نتیجہ ھے - مظھر کی غزلوں میں فارسی کی روایت اپنے آپ کو پوری طرح رونما کرتی ھے - الفاظ کے استعمال میں بھی انھوں نے فارسی کی روایات سے کام لیا ھے - اور اس طرح اپنے اظھار کو زیادہ رنگین اور پرکار بنانے کی کوشش کی ھے - ویسے ان کے کلام کا بنیادی وصف تو سادگی ھی ھے، جو ان کے زمانے کی نمایاں خصوصیت تھی، لیکن کھیں کھیں فارسی کے اثرات سے ان کا کلام رنگین اور پرکار بھی ھو گیا ھے - کھیں کھیں ھندی الفاظ ان کے کلام میں ضرور آتے ھیں، لیکن وہ تعداد میں اتنے کم ھیں کہ کھٹکتے نھیں بلکہ ھندی کے الفاظ استعمال کر کے انھوں نے اپنے کلام میں ایک چاشنی پیدا کر لی ھے - اس کا سبب یہ ھے کہ انھوں نے ھندی کے وھی الفاظ استعمال کیے ھیں جو اردو زبان کے لیے اجنبی اور نامانوس نھیں ھیں - الفاظ کے استعمال پر وہ قدرت رکھتے ھیں، لیکن ان کا استعمال معنویت کا تابع ھوتا ھے- یھی سبب ھے کہ ان کا کلام غزل کے فن کا اعلیٰ نمونہ ھے اور اس میں وہ تمام لوازم اور عناصر موجود ھیں، جن سے صنف غزل کی فنی تشکیل ھوتی ھے -

اردو غزل کی روایت میں مرزا مظھر جان جاناں کے کلام کو ایک نمایاں جگہ حاصل ھے- ھرچند کہ وہ مقدار میں بھت کم ھے، لیکن اس میں کچھ ایسی خصوصیات ھیں جن کی وجہ سے اس کو اعلیٰ درجے کی غزلیہ شاعری میں شمار کیا جا سکتا ھے - اس میں غزل کے فن کی تمام خوبیاں موجود ھیں - یہ خوبیاں اس وقت اردو غزل میں موجود نھیں تھیں- مرزا مظھر جان جاناں نے سب سے پھلے غزل کی بنیاد معنویت پر استوار کی - انھوں نے اس کو قافیہ پیمائی اور لفظی بازیگری

کے چکر سے باھر نکالا اور اس کو صنعت اور ھنر سے زیادہ ایک فن بنایا ۔ غزل کی مخصوص فضا قائم کی اور جو چیزیں اس مخصوص فضا کے لیے ضروری ہوتی ہیں ان کو اپنے کلام میں داخل کیا ۔ غزل کی مروجه علامتوں کی ان کے یہاں جو اس قدر فراوانی ملتی ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کلام میں غزل کے صحیح ماحول کو پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔ اسی لیے جہاں تک غزل کے فن کا تعلق ہے، ان کی حثیت صرف ایک فن کار ھی کی نہیں ہے ایک مجدد اور مجتہد کی بھی ہے ۔ اس حقیقت کو تقریباً تمام نئے اور پرانے لکھنے والوں نے تسلیم کیا ہے ۔ اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ وہ شمالی ہندوستان میں ریختہ کے پہلے شاعر تھے ۔ ان کی قادر الکلامی اپنی جگہ مسلم ہے ۔ انھوں نے اردو شاعری کی بنیادوں کو مضبوط کیا ۔ قافیہ پیمائی سے اس کو نجات دلائی ۔ ایہام گوئی کے چکر سے اس کو باھر نکالا ۔ اور اس طرح اردو غزل کے لیے ایک صحیح اور صحت مند ماحول پیدا کیا ۔ اس اعتبار سے اردو شاعری میں ان کی شخصیت منفرد حیثیت رکھتی ہے ۔

عبدالحی حبیبی

ملتان کا لودی شاہی خاندان

اور اس خاندان کے قرمطی ہونے کی تردید

نصر ابن شیخ حمید کی زبانی

(۲)

اورینٹل کالج میگزین بابت مئی ۱۹۴۸ میں ایک مضمون شایع ہوا میں نے اس مضمون میں وہ تاریخی اسناد فراہم کئے تھے، جو اس خاندان کے لودی ہونے، اور افغان اور پشتو زبان ہونے کے ثبوت میں موجود تھے۔ اب اس مضمون کا تتمه سپرد قلم کرتا ہوں، جو اس مقالے کا دوسرا حصه ہے۔ ان سطور میں ایک مشہور کہانی (اس خاندان شاہی کے قرمطی ہونے کے متعلق) تاریخی اسناد کی روشنی میں تحت بحث ہے۔ میں یقین کرتا ہوں، که یه بحث، برّ صغیر کے محققوں اور مؤرخوں کے لیے ایک نیا اور نرالا موضوع ہے، کیونکه میں نے، اس مضمون میں، وہ اقوال سپرد قلم کئے ہیں، جو لودی خاندان کا ایک معروف پادشاہ (نصر ابن شیخ حمید) کے پشتو اشعار سے مأخوذ ہیں۔

میں نے گذشته مضمون میں گردیزی اور ابن الاثیر اور ابن خلدون اور متأخر مؤرخ محمد قاسم فرشته کے وہ اقوال نقل کیے تھے، جس میں لودی خاندان کے قرمطی اور اسماعیلی ہونے کا ذکر ہے، قدیم مؤرخوں (گردیزی، العتبی وغیرہ) نے معاصر اور مروّج روایات کے مطابق،

اس خاندان کی داستان الحاد اور قرمطیت اور اسماعیلیت سنا کر ، سلطان محمود کو اس خاندان کے قلع و قمع میں حق بجانب ثابت کیا ہے، قدیم تاریخی متون سے بھی یہ ثابت اور روشن نکتہ واضح ہوتا ہے کہ غزنویوں کے عصر اور زمان سلطنت میں ، خاندان لودی کی داستان الحاد اور قرمطیت کی عام شہرت تھی۔ اور دور محمودی کے معاصر شعراء نے بھی اپنے قصاید مدحیہ میں مزعومہ قرامطہ ملتان پر سلطان کی فتح اور فیروزی کو موجب افتخار اور تہنیت قرار دیا ہے۔ فرخی اور عنصری کے مدحیہ قصاید میں ملتان کی فتوحات بڑی دھوم دھام، اور اور شاعرانہ طمطراق سے مذکور ہوئی ہیں۔

ضروری نہیں کہ میں ان تاریخی روایات کو یہاں مکرر نقل کروں، میرا مقصد صرف یہ ہے کہ پشتو زبان میں جو روایات، اس مطلب کے متعلق موجود ہیں ، پیش کر کے، خود افغانوں کی روایات کی روشنی میں اس داستان کی حقیقت واضح کروں، کیونکہ (المرء ادری بما فی بیته)، اصل مقصد سے پہلے کچھ مقدماتی ابحاث عرض خدمت ہیں :

لودیوں، اور آل سبکتگین کی سیاسی رقابت :

(۳۵۰ھ) کے بعد جب ناصرالدین سبکتگین ، سرزمین زابلستان اور غزنی پر حکمران ہو گیا، کابل کے برهمن شاهی خاندان کا ستارۂ اقتدار، غروب ہونے والا تھا ، مگر اراضئی ماورای غزنه اور افغانوں کے کوهسار اور دریای سندھ کی وادی ملتان تک، شیخ حمید لودی، اور اس کے خاندان کے زیر اقتدار تھی۔ اور شرق افغانستان وادئی ننگرهار اور لغمان میں ، سبکتگین کے بڑھنے والے اقتدار کا مزاحم شیخ حمید، اور

اسکا مستقل اور مقتدر خاندان تھا۔ اسلیے لودیوں اور سبکتگین، اور آل سبکتگین کی سیاسی رقابت کا میدان متواتر گرم تھا، اور یہ دونوں خاندان، اس سرزمین میں، ہموارہ بر سر پیکار تھے؛ چنانچہ سبکتگین اور اسکا بیٹا سلطان محمود (علیہ‌الرحمۃ) بار بار، لودیوں پر حملہ‌آور ہوے، اور اس خاندان کے قلع و قمع میں انہوں نے بہت تکالیف برداشت کیں۔

عہد سبکتگین میں، جب شیخ حمید، اس بڑے فاتح سے بر سر پیکار تھا، بالآخر ان دونوں خاندانوں میں ایک مصالحت منعقد ہوکر سیاسی فضا کچھ نہ کچھ صاف ہوگئی تھی، مگر جب سلطان محمود غزنی میں، بر سر اقتدار ہوا، اور ہندوستان پر چڑھائی کی، تو چونکہ اس کی فتوحات ہند کی رو میں، شیخ حمید کا حکمران خاندان، ملتان میں، پہلا مانع اور مزاحم تھا، اس لیے غزنویوں اور لودیوں کی سیاسی معاندت، ایک طبیعی اور محتمل الوقوع امر تھا، اور یہی سبب تھا کہ ہندوستان کے حملوں اور چڑھائیوں میں بار بار سلطان محمود کی، اس خاندان سے ٹکر ہوئی، اور لودیوں کی بربادی اس شہنشاہ کے ہاتھ پر ہوئی۔

یہی خاندانی رقابتیں اور لودیوں سے غزنویوں کی لڑائیاں، عصر سبکتگین (۳۵۰ھ) سے سلطان محمود کی شہنشاہی کی اواسط (۴۰۰ھ) تک (۵۰) برس جاری تھیں، یہاں تک کہ داؤد بن نصر، سلطان محمود کے طرف سے قلعۂ غورک میں محبوس ہوکر، اور بقول گردیزی وہیں جہان فانی سے گزر گیا۔

یہ داستان خونین یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ سلطان مسعود اور سلطان مودود کے عہد کے اواخر تک لودیاں ملتان اور غزنوی

باهم گرم پیکار تهے، فخر مدبر مبارکشاه کی روایت هے که جب سلطان مسعود کے خلاف ماریگله میں لشکریوں نے بغاوت کی، ملتان کے قرمطی خاندان سے داؤد کا بیٹا (جو اپنے قرمطیوں کیطرف سے بلقب شیخ ملقب تها) بر سراقتدار اور منتظر فرصت تها، جب سلطان مسعود اپنے لشکریوں کے هاتهوں سے قتل هوگیا تو انهی قرمطیوں نے حصار ملتان پر قبضه کر کے عصیان کیا، اس لیے امیر شهاب‌الدوله مودود نے، جب وه تخت حضرت غزنی پر بیٹها (۴۳۲ھ) سالار احمد محمد حاجب کی سپه سالاری میں، ایک لشکر جرار غزنیں سے ملتان کو بهیجا، قرمطیوں نے ملتان کو خالی کر دیا اور منصوره میں پناه لی۱ ۔

یه داستان اسوقت سے مربوط اور متعلق هے، جب که غزنوی خانواده، محمود اور مسعود کے بعد ضعیف هوگیا تها، اور بدوران ضعف اور کم قوتی بهی وهی رقابت اور خاندانی لڑائیاں ابهی جاری تهیں ۔ غزنوی خاندان کے سب مؤرخ ملتان کی لڑائیوں کے وقایع اور کوایف ضبط کرتے هیں، گردیزی اور فخر مدبر اور العتبی وغیره کے اقوال قابل ملاحظه هیں ۔

۱۔ اقتباسات آداب‌الحرب و الشجاعه ص ۲۸—فخر مدبر مبارکشاه کے روایت میں داؤد کے بیٹے کا نام مذکور نهیں هے مولانا سید ابوظفر ندوی نے داؤد کے نواسه عبدالله کی بابت لکهتے هیں "که سلطان مسعود نے اس خاندان کے لوگوں کو جو زنده ره گئے تهے آزاد کر دیا، یه ملتان واپس آئے، اور دوباره اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے، اس میں ابوالفتوح داؤد کا نواسه عبدالله زیاده سرگرم تها" اس کے بعد مولانا صاحب نے ایک خط کا ایک حصه نقل کیا هے، جو شامی اسماعیلی دروز فرقے کے امام کی طرف سے لکها هوا هے ' میں نے اس خط کو اس مبحث پر ایک نئی تاریخی سند سمجهکر بهت دلچسپی سے مطالعه کیا، مگر افسوس هے، که اس تمام مبحث کا تاریخی حواله کتاب میں نهیں دیا گیا هے (ملاحظه هو تاریخ سنده، طبع دارالمصنفین ص ۲۸۰—۲۸۱) اگر اس خط کا مأخذ قدیم هے تو قابل غور اور تحقیق هے، والّا نئے مؤرخون کا اقوال، قدیم متون اور اسناد کی مقابلے میں بیکار اور غیر قابل قبول هیں ۔

رسم اتہام قرمطیت:

پچھلی سطور میں ہمارے قارئین عزیز کو واضح ہوا کہ تخمیناً ایک قرن کے دوران میں یعنی سبکتگین سے سلطان مودود کے عصر تک، ایک خونین سیاسی رقابت غزنوی اور لودی خاندانوں میں موجود تھی اور آل سبکتگین غزنی، آل حمید ملتان سے پیوستہ بر سرپیکار تھی چونکہ ملتان کی پادشاھی ایک اسلامی سلطنت تھی، اور آل حمید بھی اھل قبلہ سے تھی، اسلیئے آل سبکتگین کو، ایک اسلامی خاندان سلطنت سے لڑائی کرنا اور بر سرپیکار ھونا، شرعاً ناجائز تھا۔ بنا برآن ایک طرف سے شرعی محذورات ھیں، اور دوسری طرف خاندانی رقابت، اور توسیع سلطنت کا فکر، اس لئے لازمی تھا، کہ خاندان لودی ملتان کو ایک شرعی الزام سے جایزالقتال ثابت کریں، اور شرعاً اس خاندان کے قلع و قمع میں کوشش جاری رکھیں۔

ھمارے قارئین عزیز کو معلوم ھے کہ اس دور میں، عالم اسلام کیلئے دو روحانی اور سیاسی مرکز موجود تھے، ایک بغداد میں عباسیوں کا مرکز تھا، اور دوسرا قاھرہ میں فاطمیوں کا۔ ان دونوں خاندانوں میں بھی بہت خطرناک روحانی اور سیاسی رقابت موجود تھی۔ اھل السنہ کا مرکز ارادت، بغداد اور عباسی خاندان تھا، اھل تشیع کا روحانی اور سیاسی مرکز قاھرہ اور فاطمی خاندان خلافت تھا۔

فاطمی خاندان خلافت کا موسس المہدی باللہ ابو محمد عبیداللہ ھے (۲۹۷ھ سے ۵۶۷ھ تک)، شمالی افریقا اور مصر میں انکا دور حکمرانی تھا، اور آل سبکتگین کے معاصر خلفاء العزیز باللہ (۳۶۵ھ) الحاکم بامراللہ

(٣٨٦ھ) الظاهر لاعزاز دین الله (١١٣ھ) المستنصر بالله (٤٢٧ھ) المستعلی بالله (٤٨٧ھ) وغیره تھے[۱]۔

عباسی خاندان بغداد کی عادت تھی، کہ ملوک اور سلاطین عجم کیلیے (عہد و لوای خلافت) ارسال کر کے، اور اسی واسطے سے یہی شاہی خاندانوں پر اپنی سلطنت اور مرکزی خلافت کا اقتدار قایم کرتے تھے۔ سلطان محمود اور سلطان مسعود کیلیے (عہد و لوای خلافت اور خلعت) دربار القادر بالله سے آئی تھی[۲] اور اسیطرح ملوک اور سلاطین دھلی کیلیے (عہد و لوای خلافت) آنا، سقوط خلافت بغداد تک، ایک بہت مہم اور معروف رسم تھا، اور عجمی پادشاھوں نے یہی رسم، قیام سلطنت، اور رسماً پادشاہ ہونے کیلئے بہت ضروری کام تصور کرتے تھے[۳]۔

جب فاطمی دربار خلافت، شمالی افریقا میں قایم اور مقتدر ھوا اور المہدی کا پوتا المعز لدین الله (٣٦١ھ) میں سپہ سالار **جوھر** کی قیادت میں قاھره کو فتح کیا، یہی دن بغداد اور قاھره کی سیاسی رقابت اور معاندت کا آغاز تھا، فاطمی خلافت نے نشر و تبلیغ اور دعایت

۱۔ ملاحظہ ھو دول اسلامیہ طبع استانبول ص ۸۰۔

۲۔ زین الاخبار گردیزی ص ٤٩—٧٦۔

۳۔ عصر حاضر کی سیاسی اصطلاحات اور رسوم میں بڑی، ایک جدید دولت کی رسمی شناسائی اور دوسترں کی طرف سے ضروری ہے، غزنوی عصر میں یہی کام دربار خلافت، بغداد سے ھوتا تھا، اور معاصر سلاطین اور ملوک عجم کیلئے ایک فرمان اور لواء اور جنرن ارسال ھوتا، عصر حاضر کی رسمی شناسائی، کی رسوم جدید سے ملتا جلتا ہے' از منۂ قدیم میں اس عہد و لواء کا ایک رسول (قاصد) کے ذریعے بھیجی جاتی تھی' مراکز سلطنت میں بڑی دھوم دھام سے استقبال ھوتا تھا۔ شرح اور بسط کیلئے ملاحظہ ھو تاریخ بیہقی اور طبقات ناصری اور گردیزی وغیره۔

کیلیے، تمام ممالک ایشیا میں، ایک بہت قوی دستگاہ قائم کر کے، اور تمام مراکز ملوک اور مستحکم مواقع کو اپنے داعی اور مبلغین بھیجے، اور انہوں نے خلفای عباسی بغداد کے مقابلے میں، اسقدر شدید پروپیگنڈہ کیا کہ کچھ دنوں میں نفرت اور معاندت کی لہر، ہر گوشہ میں پھیل گیا، اور فاطمی داعیوں نے پبلک اور خلفای بغداد کے مابین ایک وسیع خلیج مفارقت اور منافرت کو پیدا کیا۔ اس عداوت اور نفرت کا اندازہ فاطیمون قاھرہ کا ایک بڑے مبلغ اور ''حجت،، حکیم ناصر خسرو علوی کے اشعار سے ھوتا ھے، ان اشعار کا مخاطب المستنصر باللہ فاطمی خلیفہ ھے، اور ناصر خسرو نے اس کو تخریب بغداد، اور عباسیوں کی بربادی اور تباھی کی ترغیب و تحریص دلائی ھے:

ای خداوند زمان، و فخر آل مصطفیٰ

خنجر گلگونت را گه سر سوی خاور کنی

وقت آن آمد که روزکین چو خاک کربلا

آب را در دجله از خون عدو احمر کنی

ای نبیره آنکه زو شد در جهان خیبر سمر

دیر بر ناید که تو بغداد را خیبر کنی[1]

ترجمہ: ''اے زمانے کا پادشاہ، اور آل مصطفی کا فخر! اپنا تیغ گلگون مشرق (بغداد) کیطرف متوجہ کر، اب وہ وقت ھے، کہ خاک کربلا کیطرح، دریای دجلہ کو دشمن کے خون سے گلرنگ کر دے۔ تو اس بزرگ کے نبیرے سے ھے، جنہوں نے اپنے قوت سے خیبر کو مسمار کر دیا تھا، اب بھی وہ دن دور نہیں ھے، کہ تو بغداد کو خیبر کیطرح (تباہ) کر دیگا،،۔

۱۔ دیوان ناصر خسرو، طہران کا طبع ص ۳۱۲ -

یہی تھی، اس دو خاندان خلافت میں مخالفت اور عداوت کی صحیح تصویر، جو میں نے واقعات گذشتہ کی روشنی میں کھینچی۔ اس شرح و بسط سے میرا مقصد یہ ہے کہ ملوک اور سلاطین ایران، افغانستان، ماوراء النہر اور ہندوستان کے سیاسی روابط، بغداد سے قایم تھے، اور بغداد ایک سیاسی اور روحانی مرکز تھا، اسلیے جو لوگ اس سیاسی اور روحانی مرکز سے سرکشی کر کے، اپنا ارتباط قاھرہ اور فاطمی خلافت سے قایم کرنا چاھتے تھے، اسی عصر و زمان میں بمنزلہ خطرناک دشمن سمجھے جاتے تھے، اور بگناہ کفر و الحاد، قتل اور اعدام کر دے گئے تھے۔ خلافت بغداد کی سیاسی اور روحانی رقبۂ اقتدار میں اسماعیلی ھونا (یا که قرمطی ھونا) ایک ناجایز جرم تھا، اور جو لوگ اسماعیلی اور باطنی ھونے سے متھم ھوگئے تھے، انھیں کی جزا، قتل اور اعدام تھا۔

لیکن اس عقیدوی کشمکش اور مسلکی پیکار میں، ملوک اور سلاطین کے شخصی منافع اور سیاسی مقاصد بھی بہت بڑی حد تک ذی دخل تھے، اور جو سلاطین کسی کے ساتھ سلطنتی مقاصد اور شخصی اغراض میں اختلاف نظر رکھتے تھے، اپنے اعداء اور سیاسی مخالفوں کے استیصال کیلیے، ان پر اسماعیلی اور قرمطی ھونے کا اتہام لگانا، ایک برندہ سلاح کیطرح استعمال کیا کرتے تھے۔

دور غزنوی میں بہت امثال اور نظائر موجود ھیں، که سلاطین نے اپنے مخالفوں پر قرمطی ھونے کا الزام لگا کر قید یا قتل کیا ھے، میں اس مقصد کی توضیح کیلیے قدیم تاریخوں سے امیر حسنک میکالی اور سلطان مسعود غزنوی کے وقایع پیش کرتا ھوں که کسطرح

سلطان محمود کا یہ نامور وزیر بلخ میں بجرم الحاد اور قرمطیت، تختۂ دار پر لٹکایا گیا حال آنکہ تمام مورخین قائل ہیں کہ وزیر موصوف قرمطی نہیں تھا۔

ابوالفضل بیہقی اپنے وقت کا ایک راستگو اور حقیقت بین مؤرخ اپنی تاریخ مسعودی میں امیر حسنک کی داستان قرمطیت اور اسکی مظلومیت، پر جسطرح قلمطراز ہے، اسکا خلاصہ یہ ہے :

عصر سلطان محمود میں ، نشابور خراسان کے ایک مشہور خاندان سلطان محمود کا یہ وزیر حسن بن محمد میکالی معروف بہ امیر حسنک اسی مقتدر خاندان کا چشم و چراغ تھا ۔

یہ وزیر اواخر دور محمودی میں ، خراسان غربی کا گورنر بھی‌تھا، جس کا مرکز نشابور ہے۔ چونکہ شہزادہ مسعود، والد کی ایام حیات میں ، غزنی کے دربار میں کچھ وقعت اور اعتبار نہیں رکھتا تھا، اسلئے اسکے روابط، رجال دربار سے اچھے نہیں تھے ، مخصوصاً امیر حسنک سے شہزادہ مسعود کی کشمکش بڑی نازک صورت اختیار کر گئی تھی، کیونکہ امیر حسنک اواخر دور محمودی میں، نشابور کا مقتدر گورنر تھا، اور شہزادۂ مسعود ہرات میں۔ اسلئے بہ مقتضای (دو پادشاہ باقلیمی نگنجند) شہزادہ اور وزیر کی رقابت اور عداوت زوروں پر تھی ۔ عین شدت رقابت کا وقت تھا کہ سلطان محمود غزنی میں جہان فانی سے چل بسا ، اور شعبان (۴۲۱ھ) میں شہزادہ مسعود، اصفہان سے خراسان کیطرف حرکت کر کے ، نشابور پہنچا ۔ چونکہ محمود کی خبر مرگ ، گردو نواح میں شایع ہوی تھی، اسلئے امیرحسنک کا مقابلہ بڑے شہزادے

سے ممکن نہیں تھا ۔ اسوقت امیرحسنک کا ایک خطر ناک رقیب، خواجہ بوسہل زوزنی، غزنین سے بھاگ کر، دامغان میں بحضور شہزادہ مسعود آ پہونچا ۔ یہ زوزنی سلطان محمود کے اکابر رجال دربار سے تھا، اور بقول بیہقی بہت درشت مزاج اور مکار اور ستمگار آدمی تھا، چونکہ اس کے تعلقات، شہزادہ مسعود سے دوستانہ تھے، اسلیے عصر محمودی میں بجرم بداعتقادی اور الحاد [1] ماخوذ ہوکر، غزنی میں محبوس تھا ۔ جب سلطان محمود فوت ہوگیا، زوزنی نے فرصت غنیمت جانی اور غزنی سے بھاگ گیا، اور بہواخواہی شہزادہ مسعود خراساں پہونچکر، دامغان میں باریاب ہوا، دربار محمودی کے یہی معاتب وزیر، جو دور محمودی میں بداعتقادی کی اتہام سے حانت فدلت میں پڑا ہوا تھا، اب دربار سلطان مسعود میں، بہت محل اعتبار ہوکر، امور مملکت اور مہام سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی، زوزنی نے بمجرد وصول دامغان، اور باریابی حضور سلطان مسعود، امیر حسنک سے رقابت اور معاندت کی داستان کہن تازہ کر کے، حضور سلطان سے امیر حسنک کی قید اور ضبطی جایداد کا حکم صادر بیہقی نے امیر مسعود کا یہ حکم، بار عام نشابور میں، اسطرح ضبط کر لیا ہے:

"اکنون میفرمائیم بعاجل الحال، تا رسمہای حسنکی را بردارند و باطل کنند، و قاعدۂ کارهای نشابور در مرافعات و جز آن،

۱- بد اعتقادی اور الحاد کی تہمت اس دور میں، درباری مخالفتوں میں عام بہانہ تھا، بیہقی اپنی صداقت تاریخ نگاری کی داد دیتے ہوئے، زوزنی کے عقیدے کی بابت لکھتا ہے، کہ میں چودہ برس اس آدمی سے محشور تھا، مستی اور ہوشیاری میں، اس سے کوئی ایسی بات صادر نہیں ہوئی تھی، کہ جو اس بد اعتقادی پر دلالت کرتی، ملاحظہ ہو تاریخ بیہقی طبع طہران، ص ۲۵ -

همه برسم قدیم باز برند، و آنچه حسنک و قوم او میکردند بما میرسید بدان وقت که بهرات بودیم، و آنرا ناپسند می‌نمودیم، اما روی گفتار نبود...... ''۱۔

ترجمہ : ''اب حکم ہے کہ جلدی سے حسنک کا موضوعہ رسوم، مثلاً کر امور نشابور اور دعاوی کی اپیلوں وغیرہ کا قدیم رسم کے مطابق فیصلہ کریں - میں جب ہرات میں تھا، حسنک اور اس کے رفیقان کار، کے اوضاع اور افعال سے واقف تھا، ایکن وھاں طاقت گفتار نہیں تھا...''۔

خلاصہ : امیر حسنک کا حشر وہی ہوا، جسطرح عصر محمودی میں، زوزنی کا حشر، بجرم بداعتقادی ہوا تھا، زوزنی نے امیر حسنک کو اپنے مخصوص گارڈ کی حفاظت میں، ہرات اور بلخ کو بھیجا، اور حضور سلطان مسعود میں اصرار کر کے امیر حسنک کو بداعتقادی اور قرمطیت کے انہی اتہاموں کا شکار کیا، جن میں کچھ عرصہ پہلے وہ خود متہم تھا زوزنی کا یہ اتہام اور اصرار قتل امیر حسنک، بیہقی کے الفاظ میں بہت واضح اور روشن ہے -

''و ببلخ در ایستاد، و در امیر میدمید، که ناچار حسنک را بر دار باید کرد، و امیر بس حلیم و کریم بود، جواب نگفتی.... امیر بوسهل را گفت : حجتی و عذری باید بکشتن این مرد، بوسهل گفت : حجت بزرگتر ازین که مرد قرمطی است و خلعت از مصریان استد (چه باشد) ؟ ....''۲ -

---

۱- بیہقی ص ۳۹ -
۲- بیہقی ص ۲۰۶ -

ترجمہ : زوزنی نے بلخ میں امیر مسعود کو ورغلایا کہ امیر حسنک کو پھانسی پر لٹکانا ضروری ہے، امیر مسعود بہت حلیم اور کریم تھا، جواب میں متفکر ہو کر، بو سہل زوزنی کو کہا : امیر حسنک کے قتل میں، کسی حجت اور دلیل کی ضرورت ہے۔ بو سہل نے کہا : اس سے اور کیا بڑی حجت کی ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ قرمطی ہے، اور اس نے مصریوں سے خلعت لیا ہے.....،،۔

زوزنی نے اپنے اصرار اور پروپیگنڈے کی آگ تیز تر کر دی تھی، مگر امیر مسعود بہت محتاط اور حلیم تھا ، مگر آخر کار بلخ میں زوزنی کی مسلسل بدگوئی اور پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر، خواجہ بزرگ احمد حسن میمندی سے مشورت کر کے، یہ پیغام بھیجا : ''اگرچہ ایام پدر میں حسنک نے ہمارے دل مجروح کر دیے تھے، مگر میں نے تقصیر گذشتہ کو معاف کر دیا، اما حسنک کے اعتقاد اور قرمطی ہونے کی بابت میں آپکی رائے کیا ہے ؟،،

جب امیر مسعود کا پیغام خواجۂ بزرگ احمد حسن میمندی تک پہنچا، خواجہ نے فرمایا : ''بوسہل زوزنی را با حسنک چہ افتادہ است، کہ چنین مبالغت‌ها در خون ریختن او کردہ است ۱ ؟،،۔

چنانچہ خواجہ نے سلطان کے پیغام کے جواب میں کہا کہ حسنک کے قرمطی ہونے اور بداعتقادی کی حقیقت ہمکو ثابت نہیں، اس داستان کی حقیقت بو نصر مشکان سے پوچھنی چاہیے۔ اس کے بعد امیر مسعود نے بونصر مشکان (منشی دیوان رسالت) سے امیر حسنک کے احوال حج اور شام کی راستے سے عودت کرنے کی حقیقت پوچھی۔ بونصر مشکان نے

۱- بیہقی، ص ۲۰۷ -

عرض کی کہ صحرا کی راستے سے آنا، اس وقت درست نہیں تھا، اور حسنک مجبور ہوگیا تھا کہ مکۂ مکرمہ سے عودت کر کے، شام کا راستہ منتخب کرے۔ اسلئے خلیفۂ بغداد مشتعل ہوکر، حسنک کو قرمطی ہونے سے متہم کیا، اور یہ حقیقت سلطان محمود کو لکھ دی، مگر سلطان نے خلیفۂ بغداد کے مکاتبات اور تہمت انگیزی سے برافروختہ ہو کر کہا :

''اگر مرا درست شدی کہ حسنک قرمطی است، خبر با امیرالمومنیں رسیدے، کہ در باب وی چہ رفتے ؟ وی را من پرورده ام، و با فرزندان و برادران من برابراست، و اگر وی قرمطی است، من هم قرمطی باشم ....''[۱]۔

ترجمہ : اگر مجھ پر ثابت ہوتا، کہ حسنک قرمطی ہے، تو ضرور اس کے جزای عمل کی خبر امیرالمؤمنین کی خدمت میں پہنچ جاتی، میں نے حسنک کو پالا ہے، اور میرے فرزندوں اور بھائیوں کے برابر ہے، اگر حسنک قرمطی ہے، تو میں بھی قرمطی ہوں.....''۔

امیر محمود جیسے بزرگوار اور امور سیاست سے واقف کار پادشاہ کی رأی، امیر حسنک کے متعلق یہ تھی، چنانچہ اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ امیر حسنک کی اتہام بداعتقادی ، ایک مکمل سازش کی بنا پر تھی، بیہقی کا قول ہے : کہ پھانسی دینے کا دن تھا، اور زوزنی نے جعل‌کاری کر کے، دو بناوٹی قاصدوں کو بھیجا، اور اسطرح وانمود کیا، کہ یہ دونوں قاصد خلیفۂ بغداد کیطرف سے آئے ہیں، اور خلیفہ کے طرف سے حسنک کے پھانسی دینے کا حکم ان کے پاس ہے[۲] اس

۱- بیہقی، ص ۲۰۸ -
۲- بیہقی، ص ۲۱۳ -

جعل‌کاری اور قاصد تراشی کی اصلی علت یہ تھی کہ پبلک میں قتل امیر حسنک کی متعلق، بہت بی چینی اور ہیجان محسوس ہو رہا تھا، اور جب زوزنی نے امیر حسنک کو تخفیف اور تحقیر کی تو عام لوگ زوزنی کی اُس حرکت ناجائز سے مشتعل ہو گئے، بیہقی کے الفاظ ہیں ''عامهٔ مردم او را لعنت کردند، بدیں حرکت نا شیرین که کرد، و ازان زشتها که بر زبان راند''۔

اس کے بعد جب بوسہل زوزنی اپنی سازش میں کامیاب ہوکر، امیر حسنک کو تختہ دار پر لٹکوانے کا باعث بنا تو بیہقی نے جوش احساسات عامهٔ اور پبلک کے تاثرات کو ان الفاظ میں کھینچا ہے :

''و همه خلق بدرد میگریستند ....و خواست مشوری بزرگ بپای شود، سواران سوی عامه بتاختند، و آن شور بنشاندند . . . آواز دادند، که سنگ زنید، هیچ کس دست بسنگ نمیکرد، و همه زار میگریستند''.......۔[۱]

یہ تھی سلطان محمود کے اس وزیر بزرگ کی داستان قرمطیت اور دردناک انجام، جو بقول بیہقی ایک (مکر) اورسازش تھا، اوراس خونین ڈرامے کے دیکھنے سے عام اور خاص متاثر تھے، بیہقی کے الفاظ یہ ہیں، جس سے خواص دربار کے تأثرات اورجذبات کا اندازہ ہو سکتا ہے :

''آن روز که حسنک را بدار کردند، استادم بونصر (مشکان) روزه نکشاد، و سخت غمناک بود، چنانکه به هیچ وقت او را

۱- بیہقیؒ ص ۲۱۵ -

چناں ندیده بودم ..... و خواجه احمد حسن (میمندی) هم
برین حال بود، و بدیوان نه نشست[۱] .....،،۔

گردیزی نے بھی حسنک کے قرمطی ہونے کی داستان کو ایک تہمت محض سمجھکر، یوں تصریح کیا ہے :

''او را متہم کردند، که او به عزیز مصر میل کرد، و بدین تہمت رجم بر وی لازم شد[۲]،،۔

رجوع به مقصد :

امیر حسنک کی یہ داستان قرمطیت اور اس کا انجام دینا، یہاں میرے اصل موضوع سے باہر تھا، اور بطور مثال ہدیۂ ناظرین ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ عصر محمودی میں بوسہل زوزنی پر (جو شہزادہ مسعود کا حامی اور طرفدار تھا) رجال دربار نے اسی بد اعتقادی کی تہمت لگائی اور اس کو موقوف کرا کے قید کرایا اور جب گردش کے دوارن سے واقعات نے کروٹ لی اور سلطان محمود نے جہان فانی کو پدرود کیا، تو وہی بوسہل زوزنی کیطرف سے، امیر حسنک میکالی اسی تہمت سے متہم ہوا، اور متون تاریخ سے آشکار ہوتا ہے، کہ نہ زوزنی قرمطی تھا ، اور نہ امیر حسنک ، یہ اتہام ایک سازش اور کید و مکر تھا، اور مخالفوں کے استیصال کیلیے ایک بہانہ اور خود تراشیدہ حجت کیطرح استعمال ہوتا تھا۔

اب میں اصلی مقصد کیطرف توجه کر کے، اور اس اوضاع زمانہ کی روشنی میں، لودیوں کے قرمطی ہونے پر بحث اور غور کرتا ہوں۔

۱- بیہقی، ص ۲۱۶ -
۲- زین‌الاخبار گردیزی طبع طهران، ص ۷۷-

اس مقالے کی قسط اول (منشورۂ اورینٹل کالج میگزین بابت مئی) میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ملتان کے لودی شاہی خاندان کے افراد (جس کا موٴسس شیخ حمید لودی، امیر سبکتگین کا معاصر تھا) سلطان محمود (علیہ الرحمۃ) کی عصر سلطنت میں، الحاد اور قرمطی ہونے سے متہم تھے، اور مؤرخوں نے داؤد اور نصر کو قرمطی المذہب اور ملحد لکھا ہے۔ مقالۂ گذشتہ میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ افغانی مورخوں نے اس خاندان سلطنت کو افغان اور پشتو زبان قرار دیا ہے، اور شیخ رضی لودی، اور نصر لودی کے پشتو اشعار بھی افغانی متون تاریخی میں منقول ہیں۔ اب میں اسکا اردو ترجمہ نذر قارئین محترم کرتا ہوں:

محمد ہوتک پٹہ خزانہ (گنج پنہان) پشتو تذکرہ الشعراء میں لکھتا ہے:

"ذکر امیرالفصحاء شیخ رضی لودی علیہ الرحمہ: بد انکہ کامران خان ابن سدو خان نے سنہ ۱۰۳۸ھ میں قندھار کا شہر صفا میں (کلید کامرانی) ایک کتاب لکھی، اس کتاب میں کامران خان نے شیخ احمد بن سعید اللودی کی کتاب (اعلام اللوذعی فی اخبار اللودی) سے نقل کیا ہے[1] کہ شیخ رضی لودی شیخ حمید کا بھتیجا تھا، جب شیخ حمید ملتان میں پادشاہ بن گیا، تو اس نے اپنے بھتیجے کو (پشتونخوا)[2] کے طرف بھیجا، تاکہ اس کوہستان کے لوگوں میں دین اسلام کی تبلیغ

۱- کامران خان اور مؤلف پٹہ خزانہ کیلیے ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین کا عدد ماہ مئی -

۲- پشتونخوا، روہ اور افغانستان کا قدیم پشتو نام ہے، پشتو کے قدیم ادب میں یہی نام افغانستان کیلیے استعمال ہوا ہے، اوریہ پشتونخوا وہی تاریخی (پکتیکا) ہے، جو بموجب تاریخ ہیرو ڈوت، کوہسار افغان کیلیے قدیم عہدوں میں مروج نام تھا۔

کرے، شیخ رضی نے دو برس تک کوهستان افغان میں تبلیغ دین اسلام کی، اور بہت لوگ ان کے هاتھ پر مسلمان هوے۔ کہتے هیں کہ شیخ حمید کے بیٹے نصر نے ملتان میں ملاحدہ کے قاصدوں سے ملکر الحاد اور اسماعیلی فرقے کے عقاید کا جایزہ لیا، اور ملحد هوگیا۔ جب شیخ حمید (رحمہ اللہ) نے وفات پائی، نصر ان کا جانشین هوا، تو نصر نے قرمطیون کو ملتان آنے کی اجازت دیدی۔ جب شیخ رضی لودی اس کیفیت سے واقف هوا، تو انہوں نے یہ اشعار لکھ کر نصر کو بھیجدیے:

ترجمۂ اشعار: تو نے الحاد کیطرف رخ کیا، اور همارے دین سے منہ موڑا، هم نے سعی کی کہ همارا دین روشن هو، مگر تو نے اسے تیرہ کر دیا! جب تو تبدیل دین تیرے کی فکر میں تھا، تو، تو نے بھلے کیوں اس دین کو قبول کیا؟ تو نے اس دین سے روگردانی کی، جو تیرے آبا و اجداد کی سعی سے روشن تھا۔ آپکے نام سے لودی کو خفت هوئی۔ تو (اے نصر!) همارے خاندان سے نہیں هے هم روز قیامت تیرے دین سے بیزار هونگے،،

شیخ احمد لودی (تاریخ اللودی کا مؤلف) اسطرح نقل کرتا هے، کہ نصر نے شیخ رضی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں یہ اشعار ارسال کئے:

ترجمہ: ،،الحاد کی تہمت سے متہم هوگیا هوں، مگر میں حقیقت میں ملحد نہیں هوں۔ میرے دشمن اسطرح مجھے الزام دیتے هیں۔ اگر میں ملحد هوں، تو دشمنون کے نزدیک ملحد هوں۔ میں اسلام سے روگردان نہیں هوں، البتہ تورانیوں سے متنفر اور روگرداں هوں۔ میرا دین وهی

تذکرہ مردم دیدہ

(سلسلہ کے لیے دیکھیں شمارہ فروری مئی ۱۹۵۸ (خاص نمبر))

بشوق وصل تو عمرے زدم در تقوی
تو یار درد کشان بوده ای و من غافل

رفتم بباغ بے تو بیادت چه چاکها
از گل خریدم و بگریبان فروختم

دیده را گفتم که بعد از آمدن گل کن رهش
او غلط فهمیده عکس مدعا صورت گرفت

دل فراموش کرده ام پیشش
باز گردم بهانهٔ دارم

رباعی

فریاد که فریاد بدادم نرسید
تا گوش بت حور نژادم نرسید
گفتم مگر بدامنش دست رسد
پا بر سر کونین نهادم نرسید

از سینهٔ ریش هر چه خواهی بردار
اینجا کم و بیش هرچه خواهی بردار
جان و دل و صبر از توام نیست دریغ
غیر از غم خویش هرچه خواهی بردار

در راه وفا هیچ کشادم نرسید
رخ بر بثی ناقهٔ مرادم نرسید
مجنوں میگفت واله آیم ز پے ات
بسیار دریں ره ایستادم نرسید

وجدان - میر معصوم

خان آرزو گوید : ''میر [محمد؏] معصوم وجدان، مخاطب بعالی نسب خان، پسر میر محمد زمان راسخ [است]۔ مدت مدید رفیق نواب سیف‌الدوله عبدالصمد خان بهادر [صاحب] صوبه لاهور و ملتان بود۔ و بعد از فوت او با زکریا خان بهادر پسر نواب مذکور در آنجا می بود۔ باد دستی داشت که هرچه بدستش می آمد در اندک زمانے صرف می نمود۔ ازیں وجه قرض‌دار می بود۔ سیف‌الدوله مرحوم سوائے ماوجب رعایت هاے دیگر نیز می نمود۔ بهر حال چند سال پیش ازیں برحمت حق پیوست۔ پسرش، میگویند، در شاهجهان آباد هست و سند تخلص میکند۔ لیکن بسیار پریشان احوال است۔ بهر حال میر وجدان خالی از تلاش نیست، با شاه آفرین و میر محمد علی رائج همطرح بوده، درنبولا انتخاب اشعارش نوشته مے شود،، انتهٰی کلامه۔

مؤلف گوید که میر معصوم وجدان از اولاد حضرت سید میر کلال است قدس سره، از سادات سهرند است۔ در عهد فرّخ سیر برفاقت میر جمله مرحوم بلاهور رسیده و یکدو دفتر مثنوی معنوی نزد شاه آفرین گزرانیده قدرے اصلاح شعر هم گرفته، چنانچه خود او نزد این فقیر اظهار ایں معنی نموده که من هم شاگرد استاد شمایم۔ ظاهرا باز بجهان آباد عود نمود، چوں در عهد محمد؏ شاه بادشاه چنداں کارش نرفت و به تنگ دستی عائد گردید بلاهور مراجعت کرد و بخواجه سنگین مخاطب بغلام محی‌الدین پیوست۔ خواجه مذکور پاره خبرش میگرفت۔ بعد چندے بوساطت مولوی شرف‌الدین کشمیری که دراں ایّام نائب نواب مغفور

د ملازمت نواب نمود ـ آں جناب از بسکه کمال دوست و شاعر نواز شعر فهم بود، خان مذکور را بمدد خرچ درخور حالش سرافراز نموده خود رفیق فرمودند و همیشه گوشهٔ چشم عنایت بحالش مبذول میداشتند و ر روز پیش از عصر مشاعره به میاں می آمد و خان مذکور سر خیل جماعه، که در مشاعره حاضر مے شدند، بود ـ بعد از چند سال فقیر را و اخلاصے و اتحادے بدرجه اَتَمّ بهم رسید ـ و مدّتها در لاهور فقیر و میاں رالعین و اقف و خان مذکور و میر زین‌العابدین عاطر یکجا طرح غزلها بکردیم ـ بسیار صاحب قدرت و صاحب تلاش بود ـ سخنش خیلے وخی و رنگینی و مضامین تازه داشت و زمین‌هاے سنگلاخ طرح میکرد ـ انجمله است مطلع قصیده که در مدح نواب مغفور گفته ـــه

مرا دلے است که باشد بدرد کارش و خندد
چو غنچهٔ که بود جا به نیش خارش و خندد

یوانِ ضخیم قریب به بست هزار بیت و قصائد و مثنوی علحٰده دارد ـ و اکثر ریب خانه تشریف می آورد و صحبتها می داشت، استاد مسّلم الثبوت صر خود بود ـ روزے در خدمت نواب مغفور که زیاده از دو کس نبودند اضر شد، جناب عالی نان و خرپزه و پنیر پیش از چاشت براے ناشتا لبیدند ـ بعزیزے که در پهلوے ایشاں و مقرب آنحضرت بود ، نان پنیر عنایت فرمودند ـ و بخان وجدان همین نان و خرپزه مرحمت شد، رض کرد که بنده خود دریں محفل بدنام به تشیعّم، چرا پنیر عنایت می فرمایند ـ آنجناب ازیں لطیفه تبسّمے فرمودند ـ و به بسیار مهربانی و وشی پنیر مرحمت نمودند ـ غرض آنکه چوں خان مذکور را بعضے ز هم صحبتان نواب بنا بر رشک و حسد باآنکه سنّی بود شیعي قرار داده بودند،

لہذا لطیفه عرض کرد ـ بعد فوت ایشان زکریا خان بهادر نیز همان مدد خرج بحال داشت ، لیکن صحبت شعر برهم خورد ـ آخرالامر در هنگامه جنگ میر یحیی خان و شاه نواز خان پسران نواب زکریا خان به آزار فالج با لقوه در ماه جمادی‌الثانی سن ۱۱۶۰ هزار و صد و شصت [هجری] در لاهور رحلت کرد ـ شصت و چند سال عمر یافت

دلے بیار و بمیخانه عاشقانه در آ
بگو که شیشه فروشم بایں بهانه در آ

چرا از مے پرستی باز دارم درچمن خود را
کنم شرمندهٔ ابر و گل و سرو و سمن خود را

ناله پر سوخته اشک آبله پا
که برد رقعهٔ لخت دل ما

نقشے نه بسته‌ایم بدیوار زندگی
چوں رخنه است، هیچ نبودن نمود ما

نیامدی و شب آمد ز بےحواسی ها
گہے زمین نگرم گاه آسمان تنها

چشم در راه طلب هرچند میداند مرا
نامه‌ام می‌خواند آں شوخ و نمی خواند مرا

تا جنوں گل کرد از من دوستاں رم[۱] کرده اند
شرم چشمے هست باقی حلقه زنجیر را

۱- تصحیح از خزانه عامره و گل رعنا ـ

تیر چوگاں کرد وگوی عشق از خسرو ربود
کرد آخر کوهکن کارے بسر افتاده را

ز بسکه از لب او گشته شرمگیں یاقوت
بقصد خانه نشینی شود نگیں یاقوت

به شوق یوسف خود چون نگاه چشم سفید
سبک برون ز لحد رفتم و کفن باق است

گل کے دم همسری باو زد
این شاخچه بندگی بهار است

آئینۂ حسن رو برو نیست
بالله دماغ گفتگو نیست

شکوفه دیدن من بے تو باورت نشود
هزار شاخچه بندیست تا چمن باقیست

در سعی فنا برق شتابست دل ما
یک سوختۂ خانه خرابیست دل ما

زاهد برون چو رخت خود از بزم ما برد
او ''خیرباد،، گوید و رندان ''خدا برد،،

صد غنچه[۱] زیں گلستان برباد رفته باشد
گر رفت یک دل ما، ناشاد رفته باشد

۱- مجمع النفائس . صد گل ازین........ناشاد رفته باشد
گر رفته .... برباد رفته باشد

جاں حاضرست بستان، دل میکنی طلب، نیست
یک شیشه بود بشکست پہلوے من [۱] حلب نیست

بسیر باغ اکثر میرود آں طفل می‌ترسم
بگل از بسکه همرنگ است درگلزار گم گردد

خوش خرامے که ز دروازه بروں سیرش نیست
گاه بیگاه اگر جلوه کند کبک دریست

نقش بست ایں سرا درچشم حق بیں هست و نیست
خانهٔ آئینه را ماند که رنگیں هست و نیست
دست‌گاه آنجاست کانجا وا بود دست کرم
ورنه مال ممسکاں چوں مرغ زرّیں هست و نیست
من بیاد عشرت ننوشته در طالع خوشم
میکشم جامے که همچوں نون تنویں هست و نیست

پس از مردن مرا آں سرو قامت بر مزار آمد
قیامت آمد امّا بعد چندیں انتظار آمد

بودند رنگ‌ها طرف هم بعرض ناز
آخر حنا قبول تو گردید و دست یافت

تحویل آستین قبول اشک ما نشد
آخر نیاز ما همه بر روے ما زدند

۱- تصحیح از خزانهٔ عامره و گل رعنا -

ساقی بمحفل آمد، گفتیم چشم روشن
زد بانگ زاهد از پے اینک نزول[۱] ما شد
رسید ابر هوا خواه و مرحبا گفتیم
نمود بارش و ما مرحمت خدا گفتیم
دی گذشتم بغمت از سر دروازهٔ باغ
گل صلا زد که تماشاست تغافل کردم
این تکلّف‌ها نمی‌ماند چو رو آری بخاک
سایه یکرنگست گو صد رنگ پوشی[۲] پیرهن
ضعف است کنون زاد رهم در سفر عمر
ته ساخته نانے است ز قد برکمر من
در سیر زلف بر در گوشت بود نظر
می بینم این ستاره و شبگیر می‌کنم
یک گردش رنگست سراپاے تو و جدان
اے گرد کسے گشته چها گرد تو گردم
ترا که ظرف نباشد فلک چه کار کند
بدیگ[۳] ماند اگر قسمتت ز بے طبقی ست
ز جلوهات شکند رنگ گلشن امکان
تو آفتابی و گلگونهٔ شفق بقمی است
بباغ تاک نشاندند بخت رندان سبز
سیاه نامهٔ خود خواندم این خبر قلمی است

تو خنده تا زده چاک کرده ایم قبا
گل شکفتگی ما طفیلی و سببی است

۱- تصحیح از گل رعنا-
۲- اصل : بنما، تصحیح از مجمع النفائس -
۳- تصحیح از گل رعنا -

هرچند که خاکی بظهور آمده ایم
از محفل قدسئی حضور آمده ایم[1]

وفا

[شرف‌الدین[2] علی خان مشهور به آقاسی بیگ]

خان آرزو گوید : ''از بزرگ زادگان ایران است، از طرف پدر بمیرزا حسینی مشهور و از طرف والده بمولانا عبدالرّزاق فیاض لاهجی می رسد. نجابت و شرفت از جانبین باو رسید، شعر ارثی اوست ـ در سن یک هزار و یک صد و شصت و دو وارد هندوستان گردید ـ و در خانه عالیجاه شفقت دستگاه علی قلی خان داغستانی واله تخلص که امروز ملجا و مآب ایران [و هند] است[3] ملاقات ایں بزرگ‌زاده میسّر می آید ـ منبع اخلاق پسندیده و جامع اوصاف حمیده است ـ در وسعت مشرب با وجود تقّید مذهب در کمال شرم و آزرم است، با فقیر گوشهٔ چشم لطفے دارد و از بالقوّه اش دریافت می شود که اگر چندگاه مشق شعر میکند بوالا پایهٔ کمال استادی می رسد ـ هرچند الحال هم کم از بالفعل دیگراں نیست،، انتهٰی کلامه ـ

مؤلّف گوید که فقیر دوبار بخانهٔ خان آرزو ملاقاتش کرد ـ و یکبار بخانه‌اش رفته، بعد آں در ایامے که صفدر جنگ با عمادالملک (پیکار) داشت اکثر بخانهٔ نواب واله میدید ـ و او هم یک دوبار بغریب خانه تشریف آورده ـ دیوانے مختصر دارد ـ بعد از چندے که رفع هنگامه شد باعمادالملک رفیق شد و بمنصب سه هزاری سرافراز گردید، از طرف نواب معزی الیه ایلچی شده، نزد احمد شاه ابدالی رفت ـ و از آنجا مراجعت

۱- یه رباعی کا پہلا شعر ہے پوری رباعی گل رعنا میں ہے اور مظہر جان جاں کے نام سے بھی منسوب ہے-

۲- اضافه از مجمع النفائس -

۳- اضافه از مجمع النفائس -

نمود ـ الحال معلوم نیست که کجا می باشد، اکثر شعر خود نزد فقیر می خواند ـ لیکن بیتے بیاد نمانده ـ از انتخابے که خان آرزو کرده انتخاب نمود ــه

خوش آنروزے که میگفتند مے خواران بمحفلها
الا یا ایها الساقی ادر کأساً و ناولها

دیدهٔ یعقوب در دنبال ماست
یوسفے در کاروان داریم ما

آنکه بے رویش بچشمم نور نیست
گر بدل نزدیک باشد دور نیست

ز بیقدری چه باشد حال آں صیدے که صیادش
بجرم اینکه می‌نالد کند از دام آزادش

شوم هم صحبت غم گر نه با عیشم قریں خواهی
چرا خوشنود باشم چوں تواں اندوه‌گیں خواهی

دارم ز کاسهٔ تهی و فقر سرخوشی
مستم ز بادهٔ که مرا در ایاغ نیست

ما را از یاد می توانی برد
از خاطر ما نمی تواں رفت

رباعی

گر رستم گرد از وطن دور شود
بے قدرت و ناتواں و بے زور شود

در آب پلنگ صید ماهی گردد
در خاک نهنگ طعمهٔ مور شود

واقف سلمه الله تعالی [نورالعین]

خان آرزو گوید : ''نورالعین واقف از شرفاے پنجاب است۔ پدر و جدش قاضئ بٹاله بود که قصبه ایست از مضافات لاهور، از علوم بهره دارد و تتبع بسیار نموده شعر را خوب میگوید ۔ پیش ازیں بوساطت علی محمد تجرد اخلاص غائبانه با فقیر آرزو بهم رسانیده مکرر درخواست اصلاح اشعار خود نموده، چوں ایں عاصی ناقص را از تربیت خود فرصت نیست و بخود گماں استادی ندارد ، چند بار ابا نمود ۔ بسبب آں که آں مرد عزیز بسیار بجّد شد ۔ یک مرتبه هرچه بخاطر رسید نوشته فرستاد، ازاں باز قریب بچهار سال است خطّ او نرسیده. بهر حال مشتق سخن او رسید۔ اگر چندے دیگر بهمیں وضع مشق بر خود روا دارد گماں دارم که بپائه اعلٰے رسد۔ چوں در گوشهٔ ملک واقع شده و بقول خودش که در تمام عمر صحبت به از خودے را ادراک نکرد، آنچه میگوید از مغتنمات است ۔ پس اگر اتفاق صحبت بزرگاں فن او را دست دهد۔ ترقیات نمایاں خواهد نمود ۔ الغرض غنیمت کسے است ۔ خداش سلامت دارد ،، انتهٰی کلامه۔

فقیر مؤلّف ایں تالیف از سی سال بایں عزیز بزرگ آشنا است ۔ اول صحبت بخانهٔ مخدومی شاه آفرین مرحوم دیده بود ۔ پس ازاں گاه گاهے بغریب خانه تشریف می فرمود ۔ و روز بروز اخلاص و اتحاد رو

بتزاید آورد۔ و اکثر مشق سخن یکجا کرده میشد، از اوصاف حمیده و اخلاق او چه بیان نماید که زبان قاصر است۔ حاصل کلام علم و فضل إرث خاندان اوست۔ طالب علمی چند قریب بفراغ تحصیل دارد۔ افکار آبدارش خیلے مؤثر و به درد است، معانیٔ بلند و پاکیزه و الفاظ شسته و روانیٔ کلامش روان را تازگی می بخشد، بالفعل باینطور شعر گفتن خاصهٔ اوست۔ حدّ دیگرے نیست۔ هر چند خان آرزو ستایش میر شمس‌الدین فقیر در مجمع‌النفائس بسیار کرده۔ لیکن انصاف اینست که این عزیز روشن دل شمس‌الدینِ پنجاب است۔ دیوانے قریب بشش هفت هزار بیت ترتیب داده و قصایدٔ هم دارد۔ ترجیع بندے درکمال فصاحت و بدرد گفته، ظاهرا چنین ترجیع‌بند از قدما هم کس کم گفته باشد ۔ عاشق غزل است و رباعی هم خوب میگوید و هرچه میگوید ناخن بدل میزند ۔ و خالی از تلاش و لطف نیست، پختگی و استادی از سخنش معلوم است۔ خودش می فرماید ؎

نالهٔ چند کرده ام موزون
نه غزل نے قصیدهٔ دارم

در پرهیزگاری و متابعت سنت نبوی علیه الصلواة و السلام و آله و سلّم بجان میکوشد، کم اختلاط و کم دماغ و بے نیاز و آزاد و غنی دل است۔ در پاس آشنائی و اخلاص یکّه روزگار طبع هموار و نرمئی گفتار و کم گوئی خاصهٔ اوست ۔ طورش علٰحده از طور برادران و اقربا ست۔ فقیر باهمه وحشت مزاج صید دام خلق و اخلاص او بوده ام۔ درنیولا از یک و نیم سال که فقیر بعزم حصول سعادت حرمین شریفین برآمده ام۔ او هم بطریق سیر و تماشاے ملک دکن و سورت رفیق شفیق درین

سفر بوده، او سبحانه تعالیٰ بخیر و عافیت این مرد بزرگ را و بطفیلش این عاصی را بوطن رساند ـ و خاتمه بخیر گرداند ـ و مرا باز بزیارت روضهٔ آن سرور صلی‌الله علیه و آله و سلم مشرّف گرداند ـ آمین بربّ‌العباد بحرمت النّبی و آله الامجاد ـ از اشعار اوست ؎

سیه کرد از تغافل بسکه چشمش روزگار ما
چو گرد سرمه خیزد تیره در محشر غبار ما

سخت مشتاقم بخوش چشمان گلشن اے صبا
دیده بوس از من رسانی نرگس و بادام را

بر سر وجد است دل تا تیغ او شد جلوه‌گر
شور افزون میشود از ماه نو دیوانه را

در قفس بسیار نا شادیم ما
از فراموشان صیادیم ما

ملک ما شد کوه درد و دشت غم
وارث مجنون و فرهادیم ما

یار تا از نظر فکند مرا
بیکسی در بدر فکند مرا

کردند قبایل همه مجنون لقب ما
این حرف رسانید به لیلٰی نسب ما

دیدم به کتب‌خانهٔ هفتاد و دو ملت
غیر از سخن عشق نشد منتخب ما

گستاخ ازینست کزاں پنجهٔ مژگاں
سر چنگ نخورد است دل بے ادب ما

از محفل خوباں نتواں کرد برونم
داغم من دل سوخته ایں لاله ستاں را

اے دل ز ازل نام تو دیوانه نهادند
بدنام مکن سلسلهٔ زلف بتاں را

واقف ز دهان و کمر یار چه پرسی
از هیچ خبر نیست من هیچ مداں را

دل ز دستم به شبستان غمت گم گردید
اے چراغت بکف از رنگ حنا زود بیا

عجائب رونقے دادم من سر گشته سودا را
نمودم بوته دار از نقش پا داماں صحرا را

هوس عیش نماند از تو جدا در سر ما
تب بود در شب هجران تو هم بستر ما

در هواداریٔ بالاے تو خواهیم گریست
آب گو یک قد آدم گذرد از سر ما

خلق را در نظر شوی مه عید
گر کنی شیوه کم‌نمائیها

مے کند در نماز هم آنشوخ
از ره ناز، خوش ادائیها

بود در زندان غم یک عمر صد شیون مرا
حقّ بسیار است از زنجیر بر گردن مرا

بسکه در هر صورت آزارست دامنگیر ما
بستر بیمار گردد صفحه از تصویر ما

سخت گیران جهان هر جا که بود است آهنے
گرد کردند از براے حلقه زنجیر ما

دردمند از کوچهٔ دلدار می آئیم ما
آه کز دارالشفا بیمار می آئیم ما

اے سوخته از داغ تو صد جائے دل ما
پرواے دل ما نکنی وائے دل ما

چون لاله اگر پا نگذارد به میان داغ
پیوند نگیرد بهم اجزائے دل ما

بسر دارم از بس هواے اسیری
بشکل قفس ساختم آشیانرا

من دیوانه سر ناله ندارم واقف
چکنم سلسله جنباں شده زنجیر مرا

گفتم بسے ز درد دل امشب حبیب را
نشنید از غرور چگویم نصیب را

سیری نصیب گرسنه چشمان حرص نیست
هرچند می خورند ز دنیا فریب را

نهال عشرتم آندم بهار خواهد کرد
که شاخ و گل کنم از خون خود خدنگ ترا

بسیلاب سرشک از چهره شستم گرد هامون را
ز فیض عشق آخر شاد کردم روے مجنوں را

مرا بے اختیار آں ابروے پیوسته یاد آید
بهر جا سر بهم آورده مے بینم دو موزونرا

رفتیم یاراں، تخفیف تصدیع !
گه[۱] درد سر بود از ما شما را

ز بےسعادتیٔ من، هما پس از مرگم
ربود از سگ کوے تو استخوان مرا

چو شمع قصهٔ سوز و گداز میخوانم
بمحفلے که نفهمد کسے زبان مرا

۱- گر : گل رعنا

کشم بدیدهٔ خود از خیال آن خوش چشم
چو توتیا ۱ قلم خاک پاے نرگس را

بردی و باختی دل مارا
قدر نشناختی دل مارا

بسکه دارد صفا چو آئینه
قابل دیدنست خانهٔ ما

ما ازان تن به بیکسی دادیم
که کسے نیست در زمانهٔ ما

آتش ما نمے شود خاموش
نه فتد از زبان زبانهٔ ما

اگر از مصر یوسف نامهٔ ننوشت معذور است
که میداند سوادے نیست چشم پیر کنعان را

در سخن سازی ز بے برگی چه غم داریم ما
سیم و زر مانند نرگس در قلم داریم ما

مرا بهانهٔ آنشوخ کرده خانه خراب
خدا کند که شود خانهٔ بهانه خراب

اگرچه در قفس افتاده ام ولے صد شکر
نیم چو دیگران از بهر آب و دانه خراب

۱- تصحیح از گل رعنا -

گر کند خاصیت خاک قناعت معلوم
کیمیاگر فگند نسخهٔ اکسیر در آب

حال من بے تو چناں رو بخرابی است کہ شد
عکس من محو در آئینہ چو تصویر در آب

دل بچین زلف او گم شد صبا داند کجاست
از پریشانی خطا گفتم خدا داند کجاست

دل نمے دانم کہ دور از من کجا افتادہ است
اینقدر دانم کہ جاے در بلا افتادہ است

مے رسد چاک گریباں تا بدامانم چو صبح
طالع دیوانگیہایم رسا افتادہ است

بسکہ در سوداے زلفش کا ستم
استخوانم شانہ واری ماندہ است

ز بزمت میروم با صد ندامت
تکلّف بر طرف صاحب سلامت

نقاب بر رخ و آئینہ از کف آں خود بیں
مرا چو دید ز روے حیا گرفت و گذاشت

دلم ز سوز محبّت اگر نشد اخگر
سبب چہ بود [کہ]۱ آں دلربا گرفت و گذاشت

۱- تصحیح از گل رعنا -

فقر است اکسیر خاک آدم
این نسخه مجرّب فقیر است

طالع نالهٔ من بسکه بلند افتاد است
در نواخانهٔ نے نغمه به بند افتاد است

گر نوشتیم که از چشم تو نرگس چه کم است
چشم پوشی کن و بگذار که سهوالقلم است

بے تو امشب خون گرستم همنشینم شاهد است
گوشهٔ داماں و طرف آستینم شاهد است

سجدها بر آستانت کردم امشب تا سحر
نیست گر باور ترا اینک جبینم شاهد است

گذشته کار پریشانیم ز گفت و شنید
بزلف یار [ز][1] من اے صبا چه خواهی گفت

نمیکنیم رواں سوے او ترا اے اشک
ازاں جهت که تو طفلی ز ما چه خواهی گفت

بدم بخنده که آں یار موسم شادیست
خوشم بگریه که با من رفیق هر وادیست

بقتل‌گاه وفا پوست کنده میگویم
که کار غمزهٔ بیرحم یار جلادیست

۱- قیاسی تصحیح

من نه تنها حسن محجوب ترا حسرت کشم
کلک نقّاش از غمش مژگان خون آلوده ست

نظر لطف توان کرد بطفل اشکم
که بخاک سر راه تو یتیمانه نشست

خوش قامتی بچشم ترم جا گرفته است
سروے عجب برین لب جُو پا گرفته است

دل را بدستم آنمرهائی دراز دست
امروز اگر گذاشته فردا گرفته است

با همتے که از نظر افگنده ام دو کون
خوش چون شوم ز گریه که دنیا گرفته است

بر امید لب گزیدنهاے تیغش چون انار
قطرهاے خون من گردید دندان زیر پوست

نباشد خالی از تاثیر آواز شکست دل
خدا سازد که افتد شیشه ام از طاق نسیانت

از تهی دستی لب من کے شکایت آشناست
کاسه ام خالیست اما همچونرگس بیصداست(۱)

اضطرابے که در من افتاد است
زین دل صبر دشمن افتاد است

---

(۱) گل رعنا میں یه مصرع یوں ہے :
همچو نرگس کاسه ام خالی است لیکن بے صداست

دل بایں وارستگی کے غافل از تدبیر ماست
هادئی ما، رهبر ما، مرشد ما، پیر ماست

حال ایں دیده مپرس آه که چوں نرگس موم
دید تا آتش رخسار ترا آب شد است

برخاست تازه گلشن آں شوخ سرو قامت
با سرو گفت قمری قد قامت القیامت

یار بر عزم سفر بر زده داماں برخاست
هرکه برخاست بخود دست و گریباں برخاست

چارهٔ درد تو واقف چه تواں کرد اکنوں
که طبیب از سر بالین تو گریاں برخاست

داغ دست بو الهوس پر بے دماغم کرده است
گرمئی بے جائے داغ عشق داغم کرده است

حسن سعیت سنگ راهم صورت معشوق ساخت
دست شیریں کار تو اے کوهکن پر قابل است

من نگویم که دل ندیم غم است
حاضر الخدمت قدیم غم است

رنگ رویم زرد از دل خوردنست
خوردن دل گوئیا گل خوردنست

سر ازاں بر درت نمی آرم
که سرم باب آستان تو نیست

بر در بارگاه حضرت عشق
کمتریں چوبدار منصور است

کارم از اشک و آه پیش نرفت
که زمیں سخت و آسماں دور است

هر کجا شوخ میرزاے هست
آفتے، فتنهٔ، بلاے هست

خواجه بر دولت اعتماد مکن
که غلام گریز پاے هست

خاکِ گشتم بیا ببادم(۱) ده
که هنوزم بسر هواے هست

مکن اے توتیا قدم رنجه
دیده مشتاق خاک پاے هست

عاشق زار را نوازش کن
که عجب تار(۲) خوش صداے هست

آنشوخ کمر دوش بانداز جفا بست
معلوم نگردید کرا کشت و کرا بست

---

(۱) گل رعنا اور مردم دیده دونوں میں ''بپادم''، قیاس چاهتا هے ''ببادم'' هو-
(۲) گل رعنا : تار ، ۳۰ لا مردم دیده : یار -

بجانم از تو کدام آفت و بلاست که نیست
درون غمکدهٔ دل ببیں چهاست که نیست

از یار ناامید شدن کار سهل نیست
شویم مگر بخون جگر زاں نگار دست

جایم بقدر جبهه براں خاک در بس است
از بهر سجده همچو نگیں اینقدر بس است
قانع اگر شویم بیک قطره آبرو
ما را تمام عمر بساماں کمر بس است

صبر است دواے دل بیمار تو واقف
افسوس که کم داری و بسیار ضرور است
درد هجران توام از بس لب از گفتار بست
در نیام خامشی تیغ زباں زنگار بست

از پس مرگ کسے آب بخاکم نه فشاند
ابر غم آمد و چوں یار هوادار گریست
نعشم آنروز که از کوے تو بیرحم برند
خواهد از درد بعالم در و دیوار گریست

کے دلم از سفر عشق بساماں برگشت
رفت نالاں به جرس ایں ره و نالاں برگشت

در سراغ کمر افتاد ز سودا زلفش
هیچ معلوم نگردید پریشان بر گشت

همچو آن آبی که سوی نرگسستان میرود
گریهٔ من راه کوئی خوش نگاهان را گرفت

ز خاک دیگران گر لاله‌ها رست
ز خاک ما جگر پرکالها رست

دل که یک عمر بخون جگرش پروردم
عاقبت بر سرم آورد بلا یا قسمت

با همه قرب ز لعل تو بحرمان رفتم
تشنه مردم به لب آب بقا یا قسمت

کرد از خنده لبت بر همه تقسیم شکر
زهر خشم است نصیب دل ما یا قسمت

بخاکساری من گرد بر زمین ننشست
چنان بخاک نشستم که کس چنین ننشست

بیا و دل دهی‌ام کن که گریه ام از جوش
بسعی گوشه و دامان و آستین ننشست

شمع خاموش شود از نفس روشن من
بسکه از آتش عشقم دم گیرای هست

بزم اغیار ازو روشن و من داغم ازیں
کہ چرا شمع مرا گرمئی بیجاے هست

ایکه امروز بمن میکنی این جور و جفا
در دلت میگذرد هیچ کہ فرداے هست

آتش از خشم مزن سینۂ صد چاک مرا
کہ دریں کہنہ قفس مرغ خوش آوازے هست

هرزه پروازئی دل سخت ملولم دارد
اندریں شہر بپرسید قفس سازے هست

بگرفتارئی من نیستی اے مرغ چمن
شکرها کن کہ ترا رخصت پروازے هست

گاه مشاطه، گہی باد صبا، گاهے دل
دمبدم زلف ترا سلسله جنبانے هست

مزن اے باد صبا گیسوے جاناں برهم
کہ دریں سلسله دل نام پریشانے هست

همچو آں یار کہ باشد نگراں یارے را
چشم داغ دل من در ره پیکانے(۱) هست

سرمایۂ ز سوز درونم نه مانده است
جز داغ حسرتے ز جنونم نه مانده است

افشرده بسکه هم چو انارم فراق او
در زیر پوست قطرۂ خونم نمانده است

---

(۱) دیوان واقف میں 'بیگانے هست' لکھا ہے۔

چنانچه تیر بود جانب کماں محتاج
بابروے تو بود ناز هم چناں محتاج

من آں شکار ضعیفم که هست کشتن من
بیک اشارهٔ ابروے آں کماں محتاج

براے خاطرِ گل بستم آشیاں ورنه
من آں نیم که شوم جانب خساں محتاج

چه احتیاج به میناست ساغر جم را
نمے شود دل عارف بآسماں محتاج

منم که عشق نهاد است نام من واقف
برشته سوخته، دل داده، بے زباں، محتاج

زار نالیٔ من زار شنیدن دارد
نغمهٔ هست دریں تار شنیدن دارد

گرچه نتواں سخن تلخ شنیدن زکسے
لیک زاں لعل شکربار شنیدن دارد

هست ناصاف مشام طلب ما ورنه
بوۓ یار از در و دیوار شنیدن دارد

ماجراے است کزان جمله نمک می ریزد
سرگذشت دل افگار شنیدن دارد

بضبط ملک دل چشمت نمی پردازد از مستی
بفرماں زلف را شاید بفکر بندوبست افتد

خضر هر چند باحوال خرابم پرداخت
لیک ویرانۂ من قابل تعمیر نشد

هر که دیدم به جهاں محو فراموشی گشت
خواب من باعث درد سر تعبیر نشد

در غم هجر تو صد زخم ملامت دارم
کس نیامد بسرم بشو (کذا) (۱) که شمشیر نشد

هر کرا سودائے زلف او گریباں گیر شد
تا بگردن غرق آب آهن زنجیر شد

بیش ازیں بے حاصلی نبود که در باغ امید
هر کجا انجیر بنشاندیم، بید انجیر شد

دل شرح آتش ستم او نمے دهد
یعنی کباب میشود و بو نمے دهد

شهرے سلام میکندش همچو ماه نو
آں کج کله جواب بابرو نمیدهد

بر سر کویش گذارے داشتم نگذاشتند
با دل دیوانه کارے داشتم نگذاشتند

دل ز من بردند بازی بازی آخر دلبراں
آه یار غمگسارے داشتم نگذاشتند

خارهائے غم کشیدند از دل من دوستاں
یادگار گلعذارے داشتم نگذاشتند

---

(۱) یه شعر گل رعنا اور خزانۂ عامره میں نہیں ہے قیاس چاهتا ہے که "بشو" دراصل "بے تو" ہے (یعنی تیرے بغیر)۔

آتشم در آشیان بیرحم صیادان زدند
در گلستان مشت خارے داشتم نگذاشتند

گوشهٔ دامن کشیدند از حسد بر روے من
بر رخ از کویش غبارے داشتم نگذاشتند

اگر در آتش شوقش سپندم آفریں گوید
توقع نیست کاں نا درد مندم آفریں گوید

تو گوشے گر بفریاد من بےبرگ اندازی
چناں نالم که نے از بند بندم آفریں گوید

یعقوب اگر به بیت حزن گریه میکند
دل از غمت به سینهٔ من گریه میکند

دل بے توام ز سیر چمن وا نمی شود
چشمم بروے سرو و سمن وا نمی شود

ایں عقدۂ که در دل من از فسردگی است
چوں ژاله جز بآب شدن وا نمی شود

دلگیر زندگی شگفد از نسیم مرگ
ایں غنچه جز بصبح کفن وا نمی شود

اگر نقاب ز روے تو وا شود چه شود
نگه اگر بنگاه آشنا شود چه شود

میان ما و تو برعکس خواهش اغیار
اگر چو آینه روزے صفا شود چه شود

آخر دلم بدست نگارے اسیر شد
این خون گرفته همچو حنا دستگیر شد
رو داد بسکه ضعف مرا دور ازان جوان
تمثال من بخانهٔ آئینه پیر شد

بود در حلقهٔ اهل قناعت نامور آنکس
که او را خانه بر اندازهٔ تن چون نگین باشد

من کیستم که سجده نیارم به پیش تو
در حضرت تو زلف زمین بوس میکند

مانند ما کجاست وفادار بندهٔ
مارا برائے جور و جفا می توان خرید

ز خاک دیگران گر لاله روید
ز خاکم داغ چندین ساله روید

برنگے با خیالت عیش در یک پیرهن دارم
که از چاک گریبانم چو گل بوے تو می آید

لاله را شوق رخت کرد چنان بے آرام
که جگر سوخته از خاک درون می آید

یار صاحب مذاق می آید
به عجب طمطراق می آید

چو فریبی مرا بوعدهٔ وصل
کز تو بوے فراق می آید

آں سپاهی پسر بکشتن من
طرفه حاضر یراق می آید

تیر او چوں خورد بسینهٔ غیر
بر دل بندهٔ شاق می آید

از بر خود مراں دل مارا
که بصد اشتیاق می آید

میل پیکاں تیر او دارد
دل من سخت آرزو دارد

چو نتو سروے مگر کند پیدا
آب در باغ جستجو دارد

ناصح از آرزو مکن عیبم
هر که دل دارد آرزو دارد

راز را گفته ام گشته ام رسوا
عشق مانند مشک بو دارد

روے صحرا شد است گرد آلود
گریه ام فکر شست و شو دارد

هجر روداد چه می باید کرد
داد و بیداد چه می باید کرد

کوه غم را تواں نه تنها کند
مرد فرهاد چه می باید کرد

خوش چشم سوزنی پسران ادا فروش
دلہاے مرداں بدو بادام می خرند (۱)

مے خورده شوخ من عرق آلوده میرسد
آں فتنۂ که بیم ازو بود می رسد

مرا ایں متاعی ایست در شہر خوباں
که گم کرده ام دل کسے دیده باشد

من(۲) آں مجنون عشقم کاندریں دشت
بفرقم بسته چوں مرغ آشیاں داد

دلا زیں آشنایاں بہره بردار
گدائی کن ازیں داغ و ازاں داد

بیا دیگر بیالینم که بینی
هماں بستر، هماں پہلو، هماں داد

زلف خط سبز جاناں را پرستش میکند
هم چو هندوے که ریحاں را پرستش میکند

---

(۱) دیوان واقف میں 'خورند'۔
(۲) یه شعر حل نہیں ہوئے گل رعنا میں بھی یه تین شعر اس طرح درج ہیں۔

جامهٔ عریان تن نازک قماش افتاده است
لیک بر دوش ضعیفانت گرانی میکند

سالها شد مرده ام وز مهربانیها هنوز
ابر غم بر تربت من سایبانی میکند

تلخ شد عیش من از حسرت خواب شیرین
همدمان پیش من افسانهٔ فرهاد کنید

آنکه دل را یاد او بخشد سرور از راه دور
چون مه کنعان بچشم داده نور از راه دور

زاهد بارد اگر ماند بارباب صفا
دور نبود می نماید یخ بلور از راه دور

از براے دور بینی در تلاش عینکم
تا به بینم سوے آن حسن غیور از راه دور

وا رسیدم چون باو دیدم چراغ غول بود
هر کرا کردم تصور شمع طور از راه دور

تا بچشم شوخ خوبان نسبت او شد درست
شان ذوالقرنین را آهو نیارد در نظر

تمام چشم شد از شوق دیدن تو دلم
بسان موم که سازد کسے ازان نرگس

برائے آنکه بمالد بپائے او دیده
فتد ز گوشهٔ دستار گلرخان نرگس

بود در فن گیرائی ز بس استاد مژگانش
بر آرد ریش‌هائے جوهر از فولاد مژگانش

چند برگردانی ام با اشک و آه ازکوئےخویش
گرد سر گردم ترا گاهے بگردان خوئے خویش

در شب مولود گشتم پیر طالع را ببیں
زادم و کردم چو ماه نو سفید ابروئے خویش

گر بدانی تا کجاها من دعاگوئے تو ام
نامه ام چوں حرز خواهی بست بر بازوئے خویش

عیشها در گوشهٔ تنهائی امشب کرد دل
تیر آں ابرو کمان را دیده در پهلوئے خویش

مبارک سوختن وارستهٔ را
که در آتش سپند آسا کند رقص

کند روشن دل از آزادگی حال
شرر چوں جست از خارا، کند رقص

راه دل اکثر کند آں شوخ بے پروا غلط
گرچه نتواں کرد راه خانهٔ خود را غلط

مادهٔ بیماریٔ عاشق چه میداند طبیب
خوں غلط، بلغم غلط، صفرا غلط، سودا غلط

مطبوعہ
پنجاب یونیورسٹی پریس
لاھور

اورینٹل کالج میگزین

نومبر ۱۹۵۹ء

اورینٹل کالج

میگزین

نومبر ۱۹۵۹ء

جلد ۳۶ عدد ۱ عدد مسلسل ۱۳۹

ایڈیٹر :—

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

٭

باہتمام مسٹر احسان الحق، ہیڈ کلرک، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
پرنٹر و پبلشر اورینٹل کالج میگزین، پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور
میں طبع ہو کر اورینٹل کالج لاہور سے شائع ہوا۔

سالانہ چندہ : چار روپے

ترتیب مضامین

سی - ۹۳۸ پنجاب یونیورسٹی پریس — ۳۰۰ — ۶۰-۱-۱۳

حیات مومن

مومن کی اہم شخصیت کو آج تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اور غالب کو نمایاں کرنے کی کوشیش ہوتی رہی ہیں اور ہو رہی ہیں آخر کیوں؟ کیا واقعی مومن کی شاعری پست اور اس کا مقام شاعری فروتر ہے۔ اور غالب کا مرتبۂ سخن بلند تر، مؤمن کی زندگی میں معاصرین سعرأ کا چراغ شاعری اس کے سامنے نہ جل سکا۔ اس کے کیا اسباب تھے؟ پھر مؤمن کے مرنے پر اس کو یکسر کیوں بھلا دیا گیا، کیا اس کی روس سخن کوئی جدت اور ندرت خیال اور مضمون آفرینی سے خالی ہے یہ سوالات اور ایسے ہی دوسرے سوال برابر ذھن میں پیدا ہوتے رہے تو مؤمن کے کلام کے مطالعہ کی کوشش کی گئی، اس سلسلے میں محترم نیاز فتحپوری کا مؤمن نمبر نگار (۱۹۲۸ع) اور مقدمہ دیوان مؤمن، فاضل پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کا نظر سے گذرا، ایک حد تک ان کی کوششیں بارآور ہوئیں اور غالب کے بعد مؤمن کا نام بھی لیا جانے لگا، لیکن مؤمن کے سلسلہ میں ابھی کافی کام باقی ہے۔ نگار کا مؤمن نمبر اور مقدمہ دیوان مؤمن مرتبہ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی مؤمن پر حرف آخر نہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ مؤمن کے حالات زندگی خود مؤمن کے کلام نثر و نظم اردو و فارسی سے ترتیب دوں، اور معاصرین جو مؤمن کی شخصیت سے متاثر نظر آتے ہیں ان کی آرأ کو وضاحت کے ساتھ بیان کروں تا کہ مؤمن کا صحیح مقام متعین کرنے میں آسانی ہو، کوشش کی گئی ہے کہ معاصرانہ شہادتیں

چھوٹنے نہ پائیں، بعد کے تذکرہ نویسوں کی تصانیف سے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور مؤمن کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اردو فارسی کے مجموع نظم و نثر بھی پیش نظر رہے ہیں۔

خاندان: مؤمن کے مورث اعلیٰ کے متعلق معاصر تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ آب حیات میں مؤمن کے مورث اعلیٰ کا شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں دھلی میں آنا ظاہر کیا ہے۔ کام دار خاں اور نام دار خاں دو بھائی آئے اور شاہی طبیبوں میں شامل ہوئے موضع بلاھہ وغیرہ پرگنہ نارنول جاگیر میں ملا، ڈاکٹر سید نورالحسن صاحب نے ''دلی کا دبستان شاعری،، میں پرگنہ نارنول جاگیر میں عطا ہونا تحریر کیا ہے جو غلط ہے۔

حکیم نام دار خاں، مؤمن کے مورث اعلیٰ تھے، حیات مؤمن (ص ۳۰) میں عرش گیاوی لکھتے ہیں کہ نامدار خاں اور کام دار خاں کے نام سے نامدار خانی اور کام دار خانی دو علیحدہ خاندان چلے، کامدار خاں کی اولاد میں حکیم اجمل خاں تھے، لیکن یہ بیان غلط ہے، بقول مؤلف بہادر شاہ ظفر و (رئیس احمد جعفری) حکیم اجمل خاں کے مورث اعلیٰ بابر کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ مؤمن خود اپنے خاندان کے بارے میں صرف اسی قدر لکھتے ہیں:

ہرچند خاک گشتہ ایم، اما بہمسری چرخ سر فرونیاریم و اگر بے سر و سامانیم اما سر و برگ لجاحت (کذا) و ابرام سفلگاں نداریم سعد قلی‌خاں بہادر یکے از غلامان خاندان ما است کہ ثروت بیگم شمرو کہ مسجود ایں کمترین بےہنر و بن است داشت، و نام خود بہ صحیفۂ

عالم شاہی و سیرالمتاخرین بہم نشینی نجف خاں و نجیب خاں گذاشت۔ (انشائے فارسی مومن مخطوطہ رضا لا ئبریری رام پور)۔

اس سے صرف یہ واضح ہوتا ہے کہ سعد قلی خاں مؤمن کے خاندان کے غلاموں میں سے ہے۔

حیات مؤمن کے مؤلف کی رائے میں مؤمن علوی تھے۔ (ص۳۰) سید ناصر حبیب جو مؤمن کے نواسے ہیں ان کا بیان ضرور قابل غور ہے۔ مؤمن کی بیٹی محمدی بیگم کا نکاح مولوی عبدالغنی وکیل سیتاپور سے ہوا جو سادات سے تھے، مؤمن کی بیوی انجم النساء بقول مؤلف میخانۂ درد، خواجہ محمد نصیر نبیرۂ خواجہ میر درد کی بیٹی تھیں اور یہ بھی خاندان سادات سے تھے، مؤمن کی ہمشیرہ زادی سید عبدالرحمن آسی سے منسوب تھیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مومن کا علوی ہونا غلط نہ تھا، لیکن مؤمن کی حقیقی پھوپھی حکیم عزیز اللہ صدیقی کے نکاح میں تھیں۔ (حکیم احسن اللہ خاں کے والد) اس روشنی میں مؤلف گلشن بیخار (صفحہ ۱۹۰) کا یہ فقرہ :-

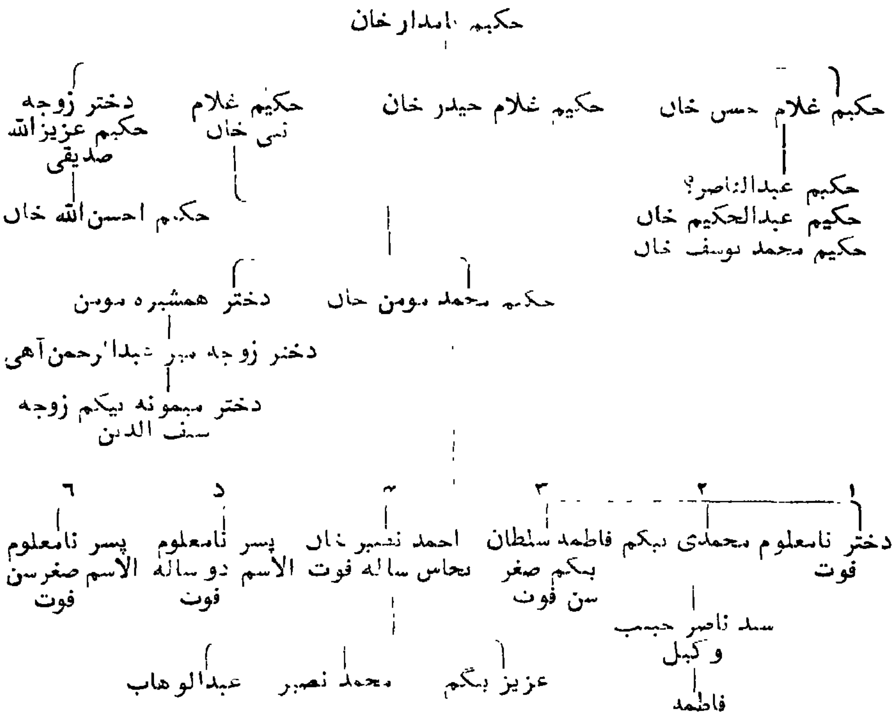
از دودمان گرامی و از خاندان نامیست

صحیح ہے اور اس کی تائید مولوی عبدالقادر خاں رام پوری کے روز نامچہ سے بھی ہوتی ہے :-

"مسکن بزرگان وے کشمیر است و جد و برادر جدش و نیز پدر و عمش نامور اند و بہ طبابت معروف"

البتہ مؤلف گلستان بےخزاں نے مؤمن کے نام سے فائدہ اٹھا کر جولاہا بنانے کی سعی بےفائدہ کی جو خلاف واقعہ ہے۔

کلیات مومن اور رقعات مؤمن کی روشنی میں مؤمن کا شجرہ خاندانی حسب ذیل ہے :



ولادت ۱۲۱۵ ھ آزاد مرحوم آب حیات میں (ص ۴۲۰)

سال ولادت ۱۲۱۵ھ دیتے ہیں عرش گیاوی [حیات مؤمن ص ۳۷] مولوی عبدالحی (گل رعنا، ص ۲۹۷) ڈاکٹر زور (تاریخ ادب اردو، ص ۱۳۱) نسیم قریشی (اردو ادب کی تاریخ ص ۱۰۴) ڈاکٹر موهن سنگھ دیوانہ، تاریخ ادب اردو بزبان انگریزی، ص ۱۳۰) ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی (دلی کا دبستان شاعری، ص ۲۴۲) آغا محمد باقر (تاریخ نظم و نثر اردو، ص ۱۰۲) وغیرہ اسی کی تائید کرتے ہیں۔ سرخوش (اعجاز سخن، ص ۲۹۵) اور نظامی (قاموس المشاہیر جلد دوم ، ص ۲۳۹) میں تاریخ ولادت ۱۸۱۷ء

مطابق ۱۲۳۳ھ لکھتے ھیں جس کی تائید میں کوئی حوالہ نقل نہیں کیا ھے اور یہ تاریخ قطعاً غلط ھے۔

معاصر تذکرہ نگار کوئی تاریخ معین نہیں کرتے، لیکن ان کے بیانات سے بعض نتیجے نکالے جا سکتے ھیں، مولوی عبدالقادر رامپوری ۱۸۲۵ء کے متعلق لکھتے ھیں:

در شاعران نوجوان مؤمن خاں است

کریم‌الدین تذکرۂ شعرائے اردو (ص ۳۴۴) میں جو ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا، عمر قریب چالیس سال ظاہر کرتے ھیں، اس سے سال ولادت ۱۸۰۷ء بر آمد ہوتا ھے:

شیفتہ دیباچہ کلیات مومن مطبوعہ ۱۸۴۶ء (ص ۵،۶) میں تحریر کرتے ھیں:

از ہجرت ہزار و دو صد و چہل و سہ سال بر وفق ھلال گشتہ بود و سنین عمرش کہ چوں عمر خضر از حد شمار برکراں باد، بہ بست و نہ رسیدہ۔

اس سے سنہ ولادت ۱۲۱۵ھ برآمد ہوتے ھیں چونکہ ۱۲۴۳ھ میں دیوان اردو کا دیباچہ تحریر کیا ھے اور اس وقت مومن کی عمر (۲۹) سال تھی۔ اس طرح سال ولادت صحیح طور پر ۱۲۱۵ھ قرار پاتا ھے۔

اس کی تائید ''مثنوی و شکایت ستم'' کے ایک شعر سے بھی ہوتی ھے۔ اس مثنوی میں ۱۲۳۱ھ میں عمر سترہ سال ظاہر کی گئی ھے:

دیکھیں آگے دکھائے کیا کیا دن
ھے ابھی سترہ برس کا سن

نام : آب حیات میں ہے (ص۱ ۴۲، ۴۲۲) کہ جب پیدا ہوئے تو شاہ عبدالعزیز صاحب نے آ کر کان میں اذان دی اور مؤمن خاں نام رکھا۔ گھر والوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور حبیب‌اللہ نام رکھنا چاہا، لیکن شاہ صاحب ھی کے نام سے نام پایا۔ عرش گیا وی ''حیات مؤمن،، (ص۳۷) میں لکھتے ھیں :

شاہ صاحب نے مؤمن علی نام رکھ دیا، گھر والوں کی طرف سے دوسرا نام حبیب اللہ پیش کیا گیا شاہ صاحب نے فرمایا نہیں، عورتوں نے پھر دست بستہ عرض کیا، کہ حضور مؤمن تو جولاھے کو کہتے ھیں کوئی اور نام رکھ دیجیے، حضرت نے فرمایا۔ اسی نام سے یہ دنیا میں نام پائے گا :

یہ روایت قابل اعتماد نہیں۔ عرش اس سلسلے میں کوئی حوالہ نہیں دیتے کہ یہ روایت انہیں کس ذریعہ سے مہیا ہوئی۔ ھماری نظر میں آزاد کی روایت حبیب‌اللہ نام رکھنے کی حقیقت پر مبنی معلوم ھوتی ھے لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب نے نام محمد مؤمن تجویز کیا تھا اور اس کی تائید ھمیں معاصرانہ شہادتوں سے ملتی ھے، شیفتہ گلشن بیخار (ص۱۹۵) میں محمد مؤمن خاں لکھتے ھیں۔ سر سید احمد خاں آثار الصنادید باب چہارم (ص۱۹۲) میں یہی نام تحریر کرتے ھیں۔ یادگار شعرا، (ص۱۹۹) سے بھی اسی کی تائید ھوتی ھے۔ گلستان سخن (ص ۴۴۳) میں محمد مؤمن خاں ھی نام ھے، معاصرانہ شہادتوں سے محمد مؤمن نام ثابت ھے، لیکن اختصار کی بنا پر مؤمن نام عرف عام میں رائج ھوگیا اور نساخ بھی اسی نام کا سخن شعراً (ص۴۶۷) میں ذکر کرتے ھیں۔ حبیب اللہ نام مؤمن کی کسی تحریر میں نہیں ملتا۔

مؤمن نے اپنے نام کا معمہ بھی نظم کیا ہے۔ :

کیفیت وصال بس اب کچھ نہیں رہی
کیونکر نہ ہوں ملول میں شب کچھ نہیں رہی

''ملول میں ،،لیل بمعنی شب خارج کریں ۔ تو مؤمن رہ جاتا ہے ۔ البتہ اس کا امکان ہے کہ مؤمن کے پھوپھا حکیم عزیز اللہ صدیقی نے ''حبیب اللہ،، نام تجویز کیا ہو حکیم احسن اللہ خاں مؤمن کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے ۔

ابتدائی تعلیم ۔ تذکرۂ نویس ابتدائی تعلیم کے بارے میں خاموش ہیں شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ مکان سے قریب تھا ۔ غالباً ابتدائی تعلیم اسی مدرسہ میں پائی ۔ مؤمن اپنی پہلی مثنوی ''شکایت ستم،، میں مکتب کی تعلیم کا حوالہ دیتے ہیں :

یعنی طفلی سے ہوں میں پیر مغاں
بلد راہ گم رہان جہاں

تھے برس ہم شمارۂ افلاک
کہ ہوا، پائمال صورت خاک

ہائے بچپن میں دل کا آ جانا
کچھ سمجھتے نہ تھے پہ کیا جانا

شوق طفلانہ دل کے پاس گئے
ہوش کے آتے ہی حواس گئے

کچھ نہ سیکھو، سکھا دیا دل نے
سبق الٹا پڑھا دیا دل نے

لذت آئی جو لفظ الفت سے
پڑھتے دائم الف کے آگے تے

بسکہ تھا دل میں شکوۂ بیداد
سبق الحمد کا نہ رھتا یاد

حفظ قرآن و یاد مصحف رو
فرصت اک دم نہ روز و شب میں کبھو

اس سے اتنا اندازہ ھوتا ھے کہ ابتدائی تعلیم مکتب میں ھوئی اور نوبت حفظ قرآن تک پہنچی تھی، یہ بھی امکان ھے کہ مؤمن حافظ قرآن ھوں - یہ ابتدائی تعلیم نو برس کی عمر تک جاری رھی کہ مؤمن نے کوچہ عاشقی میں قدم رکھا اور تعلیم سے دل اچاٹ ھوگیا، لیکن یہ محبت راس نہ آئی اور کچھ مدت بعد وہ محبوبہ نوعمری اور کمسنی میں عالم جاودانی کو چل بسی - اس صدمہ جانکاہ سے مؤمن کی جان پر آ بنی والدین پریشاں ھوئے علاج معالجے شروع ھوگئے خود کہتے ھیں :

ذکر درماں سے اور درد بڑھے
نام تبرید سے بخار چڑھے

خصمی و کینہ غم گساروں سے
دشمنی سخت دوستداروں سے

ایک دن غش کی حالت میں تھے کہ ھمسایہ لڑکی آئی اور بطور ھمدردی مؤمن کا سر اپنے زانو پر پر رکھا تو مؤمن نے آنکھ کھولی اور ایک سمن اندام کو چارہ گر پایا - اس وقت مؤمن بارھویں سال میں تھے آخر مرحومہ محبوبہ کی یاد دل سے جاتی رھتی ھے اور عشق و محبت کا

دوسرا دور شروع ہو جاتا ہے، لیکن یہ واقعہ بھی درِ اندازوں کی سازش سے کھل جاتا ہے ۔ اس وقت والدین کی برھمی از حد بڑھ جاتی ہے اور یہ دھمکی دی جاتی ہے کہ ہم تجھے مکتب میں بزور پڑھائیں گے یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نو سال کی عمر سے سلسلہ درس مؤمن ختم کر چکے تھے ۔ اور تیرھویں سال میں دوبارہ جبراً سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے پر مجبور ہوگئے ۔ چند اشعار اس واقعہ کے قابل ملاحظہ ہیں :

دیکھتا کیا ہوں ایک زہرہ جبیں
جلوہ افروز ہے سر بالیں

سال عمر اب تھے ہم شمار بروج
کہ ہوا اختر بلا کا عروج

واہ اس لب کی چارہ فرمائی
بات میں آ گئی توانائی

ایک برس تک یہی رہا عالم
زندگی کے مزے اٹھائے بہم

ہم سمجھتے تھے اب تلک معصوم
یہ سیہ کاریاں نہ تھیں معلوم

لاغری کی جو یوں حکایت تھی
جور استاد کی شکایت تھی

تو سہی ہم بھی ناک میں دم لائیں
بھیجیں مکتب میں پھر بزور پڑھائیں

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مؤمن پھر مدرسہ میں بھیجے گئے۔ سرخوش ''اعجاز سخن،، میں لکھتے ہیں :

فارسی عبداللہ خاں علوی سے جو عدیم المثال عالم تھے۔ تحصیلی تھی، اگر یہ روایت درست ہے تو اس طرح صہبائی اور مؤمن ایک ہی استاد کے شاگرد ٹھہرتے ہیں۔ فارسی میں غالب اور مؤمن اور صہبائی یک ساں مقام رکھتے ہیں ''دلی کالج،، میں جب فارسی کے مدرس اول کی ضرورت درپیش ہوئی تو پہلے غالب اور پھر مؤمن خاں کو دعوت ملازمت دی گئی اور دونوں کے انکار پر یہ اسامی صہبائی کو ملی۔

لیکن علوی سے مؤمن نے فارسی پڑھی ہو یہ امر مشتبہ ہے مؤمن جو سعدی اور حافظ کو خیال میں نہ لاتے تھے وہ علوی کا شاگرد کہلانا کسطرح پسند کرتے۔

آب حیات (ص ۴۴۲) میں ہے کہ بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پہنچایا۔ ان سے عربی کی ابتدائی، کتابیں پڑھتے رہے حافظہ کا یہ حال تھا کہ جو بات شاہ صاحب سے سنتے تھے فوراً یاد کر لیتے تھے اکثر شاہ عبدالعزیز صاحب کا وعظ ایک دفعہ سن کر بعینہ اسی طرح ادا کر دیتے تھے۔ تمام تذکرہ نویس اس کی تائید کرتے ہیں، البتہ عرش گیاوی حیات مؤمن (ص ۳۷)میں یہ وضاحت کرتے ہیں۔

تعلیم بھی ان کی اسی مدرسہ میں ہوئی کچھ کتابیں تبرکاً شاہ عبدالعزیز صاحب سے اور بقیہ علامہ شاہ عبدالقادر سے پڑھیں اور یہیں عربی، فارسی، حدیث، فقہ، منطق و معانی وغیرہ کی تکمیل ہوئی۔

بغیر حوالہ شاہ عبدالعزیز صاحب سے تعلیم حاصل کرنے کی روایت قابل قبول نہیں ، پھر شاہ عبدالقادر صاحب اکبرآبادی مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ اور یہیں سید احمد شہید نے ۱۲۲۳ھ کے متصل شاہ عبدالقادر صاحب سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی تھی مؤمن کا شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ میں تعلیم پانا کسی نے نہیں لکھا ہے ، قرینہ ضرور ہے کہ گھر قریب ہونے کی وجہ سے ابتدائی تعلیم شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ میں پائی ہو اور اعلیٰ کتب شاہ عبدالقادر صاحب سے پڑھی ہوں ۔ حدیث ، فقہ اور ، منطق وغیرہ کا پڑھنا بھی ثابت نہیں کیا ہے، البتہ مولوی کریم‌الدین تذکرہ شعراے اردو (ص۳۴۴) میں تحریر کرتے ہیں :

حال استعداد کا ان کی یہ ہے کہ عربی میں شرح ملاّ تک اور فارسی خوب جانتے ہیں اور طب میں بھی مہارت ہے۔

فارسی رقعات سے ان کی علمی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے، بعض رقعات میں قرآنی آیات بر محل استعمال کی ہیں غالباً اپنی وارستگی طبع کی وجہ سے وہ نوعمری میں تعلیم سے بیزار رہے؛ چنانچہ پہلی مثنوی سترہ سال کی عمر میں لکھی گئی ہے اور نو سال کی عمر سے کوچہ عاشقی میں وہ قدم رکھ چکے تھے۔

تحصیل طب : آب حیات (ص۴۲۲) میں آزاد نے نقل کیا ہے :

جب عربی میں کسی قدر استعداد ہوگئی تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور ان کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔

مولوی کریم الدین گلدستۂ نازنیناں (ص ۱۰۲) اور تذکرۂ شعرائے اردو (ص ۳۴۴) میں طب میں دخل بتاتے ہیں۔

حکیم اس پایہ کے کہ بوعلی سنیا اگر تمام عمر قانون طبابت کے سیکھنے میں گنوائے پر ان کے سامنے نبض دیکھنے کا شعور نہ آئے۔

بزم سخن (ص ۱۰۷) میں سید علی حسن خاں طب میں مہارت کا ذکر کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں در طب دستگاہ وافر داشت

سخن شعرأ (ص ۴۶۷) میں نساخ بھی طب میں خوب دخل رکھنا بیان کرتے ہیں۔

خود کہتے ہیں :

طبیب وہ ہوں کہ ہو سوز سینۂ بلبل

نظارۂ رخ گلفام سے مجھے محسوس

فارسی رقعات میں مومن اپنے پھوپھا حکیم عزیزاللہ صدیقی کی علالت کے سلسلے میں حکیم احسن اللہ خاں کو جو دھلی میں نہ تھے۔ بسلسلہ معائنہ مکان پر جانا بیان کرتے ھیں اور یہ شکایت کرتے ھیں کہ انہوں نے مجھے پاس نہ بلایا اور پھوپھی صاحبہ نے حال ان کا بیان کیا۔
امتہ الفاطمہ المتخلص بہ صاحب سے محبت علاج کے سلسلے میں ھونا مومن نے خود بیان کی ھے۔

علم نجوم : کریم الدین گلد ستہ نازنیاں (ص ۱۰۲) میں لکھتے ھیں۔

فنون حکمیہ اور احوالات سیّارات میں گوھر نایاب

اور تذکرۂ شعرائے اردو میں ہے :

مومن مذکور علم نجوم اور رمل سے بھی بہت خوب آگاہ ہے۔

تذکرۂ آب حیات میں تفصیلی واقعات لکھے ہیں یہ دوسروں کے بیان کردہ حالات تھے، لیکن کلیات مومن میں مومن نے جابجا اختر شناسی کا ذکر کیا ہے، کہتے ہیں :

کروں جو گردش انجم کی میں رصد بندی
فدا ہو وجد میں آکر روان بطلیموس

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

سیارہ شناسم و ندانم
تا طالع و کوکبم چہ باشد

حکیم احسن اللہ خاں کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں (انشائے فارسی مخطوطہ رضا لائبریری) :

افسوس کہ مومن اس اعتقاد کے باوجود کہ کوئی ذرہ بغیر خدا کے حکم کے حرکت نہیں کر سکتا، ستارہ پرست ہے اور اس قدر بےتعلقی کے باوجود صبح سے شام تک اسطرلاب ہاتھ میں ہر ایک کے سوالات کا جواب دیتا ہے، جب سورج غروب ہوتا ہے تو ان رصد بندوں کی مجلس سے اٹھتا ہے۔

شطرنج : شطرنج سے کمال مناسبت تھی، جب کھیلنے بیٹھتے تھے، تو دنیا و ما فیہا کی خبر نہ رہتی تھی، اور گھر کے نہایت ضروری

کام بھول جاتے تھے۔ دلی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابہ قریبہ رکھتے تھے، اور شہر کے ایک دو شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے (آب حیات ص۴۳۲) کرامت علی خاں کی وفات پر قطعہ تاریخ کہا ہے جس سے ذاتی تعلقات اور شطرنج دانی کا اظہار ہے :

منصوبۂ مرگ بیں کہ بے مات
نگذاشتہ ہیچ آدمی را

زیں خانہ، بہ خانۂ عدم برد
یک کشت کرامت علی را

افسوس کہ طرفہ شہ رخے خورد
نادیدہ عراے مدعی را

تا فکر شمار سال تاریخ
زچ کردہ، رقوم ہندسی را

گفتیم کرامت علی خاں
تہ کردہ، بساط زندگی را

موسیقی : سید ناصر حبیب ناصر نبیسۂ مؤمن کی روایت ہے [دیوان مؤمن مرتبۂ ضیا احمد بدایونی مقدمہ ص۵۲] کہ مؤمن مرحوم کی رنگین مزاجی نے موسیقی کے فن لطیف کی طرف توجہ کی تو وہ نام پیدا کیا، کہ لوگ ان کے کمال کے معترف ہوگئے نظیر بین باز نے جو اس زمانے میں استاد تھے ان کے انتقال پر بین اٹھاکر رکھ دی کہ اب دلی میں کوئی قدرداں نہیں رہا :

گل رعنا (ص۱۷۱) میں ہے کہ خاندان خواجہ میر درد کو موسیقی میں

انتہا سے زیادہ لگاؤ تھا ، چنانچہ مؤمن کے خسر خواجہ محمد نصیر (متوفی شوال ۱۲۶۱ھ)نبیسۂ خواجہ میر درد کو بھی موسیقی میں کمال حاصل تھا، اور ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ان کے ہاں محفل سماع منعقد ہوتی تھی اور علماء و مشائخ اور اکثر امراء شرکت کرنا فخر سمجھتے تھے۔

یہ مجلس سماع خواجہ محمد نصیر کے مرنے پر مولوی یوسف علی صاحب سجادہ نشین نے جاری رکھی، مؤمن موسیقی سے فطری لگاؤ رکھتے تھے، میر ناصر احمد نبیسۂ ہمت خاں، بقول سر سید احمد خاں نغمہ سرائی اور بین نوازی میں یکتائے روزگار ہیں یہ بھی خواجہ شاہ محمد نصیر کی مجلس میں شریک ہوتے تھے ۔ ان کے بعد انتقال مولانا یوسف علی سجادہ نشین کی مجلس میں شریک ہوتے، اب جانب اودھ روانہ ہوئے ہیں (آثارالصنادید ص۲۷ ۲ طبع اول غالبا ۔ سید ناصر حبیب نے انہیں میر ناصر احمد بین‌نواز کو نظیر بین‌باز بیان کیا ہے جو سماعی غلطی ہوگی۔

مؤمن کو موسیقی میں دخل ضرور تھا ۔ خواہ کمال ہو یا نہ ہو مثنوی تف آتشیں سے چنگ نوازی کا ثبوت ملتا ہے :

زمزمہ سازی سے دم سازی
چنگ نوازی، گوش نوازی

تعویز نویسی : ضیاءاحمد صاحب (مقدمہ دیوان مؤمن ص۲۰) کہ بعض تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ فن عملیات میں بھی دخل تھا ۔ مؤمن قصیدہ نعتیہ میں (کلیات مؤمن ص۱۰ طبع نول کشور) ۱۹۳۱ء

فن عملیات سے اپنی وابستگی ظاہر کرتے ہیں :

طلسم ماہ لکھوں گر پئے زباں بستن
بنائے مہردھن چرخ ، نکتہ جاسوس

یقیں کہ زہرہ و خورشید میں مقابلہ ہو
پڑھوں جو میں پئے دوری دعائے بدریطوس

حیات معاشقہ: مؤمن کی افتاد طبع عشق دوست تھی، مثنوی شکایت ستم (۱۲۳۱ھ) میں وہ خود کہتے ہیں کہ نو سال کی عمر سے انہیں آغاز تعلیم ہی میں محبت کا چسکا پڑ گیا، تعلیم سے بےتوجہی بڑھتی گئی :

تھے برس ہم شمارۂ افلاک
کہ ہوا پائمال صورت خاک

اور اس کا بھی مجھ پہ دل آیا
کھو کے دل میں نے جان کو پایا

ہائے بچپن میں دل کا آ جانا
کچھ سمجھتے نہ تھے، یہ کیا جانا

شغل طفلانہ دل کے پاس گئے
ہوش کے آتے ہی حواس گئے

کہتے ہیں کہ کبھی کبھی ملاقات ہوتی اور وہ بھی جی کا وبال ۔ اسی طرح دو سال گذر گئے آخر محبت کا چرچا ہوگیا اور ملاقاتیں بند ہوگئیں ۔

آفت جان و دل فراق و وصال
الغرض یوں ہی کٹ گئے دو سال

جب پڑی دونوں کے قلق کی دھوم
اتنے ملنے سے بھی ہوئے محروم

اس نے ناچار پھر چھپایا منہ
اس وفا پر نہ پھر دکھایا منہ

اتفاق سے مؤمن کے یہاں تقریب ہوئی اور اس میں وہ بھی میہماں آئی۔ ملاقات کا موقعہ مل گیا ایک خالی مکان میں دو دن خوب ملاقاتیں رہیں:

ہوئی شادی ہمارے ہاں یک بار
آئی مہماں وہ دولت بیدار

ایک خالی مکان میں آ کر
مل گئی، چپکے چپکے ڈھب پا کر

آگیا دو ہی دن میں روز نشور
منتشر ہوگئی وہ بزم سرور

لیکن یہ جدائی جاں گسل ہوئی۔ اور محبوبۂ اولیں جنت کو سدھاری بیان یہ ہے:

بہر تسکیں شدت خفقاں
ٹھہری گلگشت روضۂ رضواں

گئی جنت میں بسکہ ایسی حور
ہوئی بیتاب، کیسی کیسی حور

کلیات مؤمن میں ایک ترکیب بند، بصورت مرثیہ ملتا ہے غالباً مؤمن نے اسی موقعہ پر کہا ہے آغاز ہے :

خمیازہ عیش کا مرا دل کھینچتا ہے آج
آغوش رشک حلقۂ اہل عزا ہے آج

مجکو نہ اپنے ساتھ عدم میں لئے گیا
ہردم شکایت نفس نارسا ہے آج

بیٹے مجھے جو روئے۔ وہ کہتے تھے بارہا
کیا روئیے، اسی کا ہمیں پیٹنا ہے آج

مرنا یہ کس کا جان سے بیزاز کر گیا
ماتم میں مررہا ہوں میں یہ کون مر گیا

ایک شعر سے محبوبہ کی عمر کا پتہ چلتا ہے :

ایسے مہ دو ہفتہ کو رنج خسوف ہو
دوراں کا اعتبار نہیں اے فلک ہنوز

ترکیب بند کا آخری شعر ہے :-

اے مرگ اس عذاب سے آ کر چھٹا مجھے
مومن ہوں قیدخانہ ہے دارالفنا مجھے

عرش گیاوی (حیات مومن صفحہ ۵۲) کا یہ تحریر کرنا :-

مگر جیسا کہ سنا گیا ہے، قرین قیاس ہے کہ صاحب جی دلی میں واپس آئیں اور یہیں ان کا انتقال ہوا، اور مرثیہ ان کے مرنے پر کہا گیا، قطعاً غلط ہے۔ ترکیب‌بند میں جس محبوبہ کے مرنے کا حوالہ ہے وہ

محبوبۂ اول ہے، صاحب کے مرنے کی نسبت تذکروں میں کوئی حوالہ نہیں ملتا، یہ ترکیب‌بند مؤمن کے دیوان مرتبہ ۱۲۴۳ھ میں موجود ہے شیفتہ نے ۱۲۵۰ھ میں گلشن بیخار میں صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ صاحب کو لکھنؤ گئے برسیں ہوئیں، اس سے ۱۲۵۰ھ تک صاحب کی حیات متحقق ہے -

مؤمن کے لیے محبوبۂ اولین کی موت جانکاہ حادثہ تھا، شدت غم سے نیمجان ہو گئے، کھانا پینا چھوڑ دیا والدین چارہ‌سازی میں مصروف ہوے لیکن کہیں درد محبت کا بھی علاج ہو سکا ہے خود روایت ہے :

چارہ سازوں سے نفرتیں کیا کیا
حرف تسکیں سے وحشتیں کیا کیا

ایک مدت تلک یہ حال رہا
ملک‌الموت کا خیال رہا

دوربینی ستم فریبوں کی
چارہ‌سازی ستم، طبیبوں کی

آخر پڑوس کی ایک نو عمر لڑکی نے دلدھی کی، اور مؤمن کا زخم مرگ محبوبہ مندمل ہونے لگا، اب بارہ سال کی عمر تھی کہ دوسری حکایت محبت شروع ہوئی :

دیکھتا کیا ہوں ایک زہرہ جبیں
جلوہ‌افروز ہے سر بالیں

اس محبت کا سلسلہ باوجود بدنامی اور رسوائی کافی مدت تک چلا، آخر ۱۲۳۱ھ میں سترہ برس کی عمر میں اس محبت کا انجام ہوتا ہے، واقعہ

اس طرح ہے کہ ایک دن محبوبہ نے ملاقات کا پیام ایک فریبی عورت کے ہاتھ بھیجا، جس وقت وہ آئی تو مؤمن اپنے کمرے میں بیٹھے شاعری کی فکر میں مدھوش تھے، پیامبرہ سے کہا کہ دو شعر کہہ لوں ابھی آتا ہوں، پیامبرہ کو یہ انداز پسند نہ آیا ، مثل ہے کہ لیلی کی گلی کا کتا بھی عزیز ہوتا ہے، مؤمن نے پیامبرہ کی تواضع نہ کی، اس عمل سے وہ برھم ہو گئی جا کر کہا میں گئی تو کمرہ بند پایا، میں نے پیام ادا کیا تو اندر سے جواب دیا کہ اچھا آؤں گا، جھانکا تو کسی کو اندر پایا یہ سن کر محبوبہ دویمیں سخت مشتعل ہو گئی ، مؤمن نے پھر ملنے کی جس قدر کوششیں کیں وہ ناکام رہیں آپ کہتے ہیں :

دیکھیں آگے دکھائے کیا کیا دن
ہے ابھی سترہ برس کا سن

مؤمن آ تو بھی اپنے نام پہ جا
نام کو ان بتوں کے آگ لگا

مثنوی قصہ غم ۱۲۳۵ھ : ۱۲۳۰ھ میں مؤمن کی شاعری شباب پر تھی، اور طبیعت بھی مسرور، بذلہ گوئی اور نکتہ سنجی میں فرد تھے :

جوں غنچہ سدا کھلے ہی جانا
ہر وقت ہر آن مسکرانا

دیوانوں سے شوق بے نہایت
اشعار کا ذوق بے نہایت

تصحیح سخن پہ طبع مائل
علم شعرا میں فرد کامل

بے بذلہ سنی نہ بات کوئی
ختم اس پہ ہوئی لطیفہ گوئی
مل چلنے کی ہر کسو سے تھی خو
تھا یار، غرض، جہاں میں تھا جو

طبیعت عشق پسند تھی اس لیے چین سے نہ بیٹھا گیا اور ایک نئی چھیڑ چلی :

آغاز محبت:

ناگاہ کسی سے دل لگایا
اک رشک پری سے دل لگایا

آنکھ آفت جان سے لڑائی
اک ترچھی نگہ کی برچھی کھائی

کی دوستی ایسے بے وفا سے
بیگانہ رہے جو آشنا سے

یہ محبت بارور نہ ہوئی اور مؤمن کے پھندے میں وہ حور وش کافرہ نہ آئی، اس محبت کا انجام ناکامی پر ہوتا ہے، مؤمن کی ان التجاؤں پر بھی اس کا دل نہ پسیجا :

لب تشنگی حسین و عباس
امواج فرات و شرم الیاس

ان سب کی مجھے ہزار سوگند
سوگند ہزار بار سوگند

ہے تجھ سے مجھے دلی محبت
گو تجھ کو نہ ہو مری محبت

سچ جان کہ دل سے ہے تری چاہ
واللہ باللہ ثم باللہ

بس مؤمن دل گداز خاموش
اب طاق ہوئی ہے، طاقت ہوش

۱۲۳۶ھ مثنوی قول غمین - اس مثنوی کے آغاز میں بیان کرتے ہیں کہ میں نے جس قدر اسے منانے کی کوشش کی، وہ اسی قدر برہم ہوئی، آخر مجبور ہو کر دل پر پتھر رکھنا پڑا، رفتہ رفتہ اس کا غم دل سے دور ہوا، اور جنون محبت کا اثر زائل ہوا صحت درست ہونے لگی، چہرہ پر سرخی دوڑ گئی، اور دوستوں میں بیٹھنا اٹھنا اور شعر گوئی شروع ہو گئی، بیان ملاحظہ ہو :

یاروں میں ہنسنے کا غل آٹھ پہر
وقف لب، خندۂ گل آٹھ پہر
نغمہ‌سنجی و خوش‌الحانی و بس
شعر گوئی و غزل خوانی و بس

ایک دن سیر کو نکلے ایک دوست کے یہاں جا رہے تھے کہ پس چلمن ایک عورت کو نظارہ بازی میں مصروف پایا اس نے اشارہ بازی بھی کی، مؤمن ٹھٹھک کر رہ گئے کہ الہٰی یہ کیا ماجرا ہے دعوت نظارہ کا کیا مطلب ہے اگر زن بازاری ہے تو کیوں نہیں بلاتی، آخر آگے بڑھے اور گھر آ کر اسی الجھن میں تھے کہ دعوت نظارہ کا کیا مقصد تھا -

آخر پھر تدبیروں سے وھاں پہنچے وہ چاہ کی تو قائل نہ تھی البتہ ظریفانہ مزاج اور مزاح پسند تھی آمد و رفت ھونے لگی، مومن جاتے دل بہلا کر چلے آتے ایک دن وھاں بیٹھے ھوے تھے کہ کسی مہمان کی آمد کی خبر ھوئی پردے کی وجہ سے مؤمن کو باھر نکلنا پڑا، اور پھر سوچ کر گھر روانہ ھو گئے ۔ دوسرے معمول کے موافق وھاں پہنچے ۔ تو صاحب خانہ نے کہا کہ کل جو مہمان آئی ھیں وہ بیمار ھیں ذرا نبض دیکھ کر دوا تجویز کیجے اب آگے مومن کی زبانی کہانی سنئے :

میں نے اس نبض پہ جو ھاتھ دھرا
ھاتھ سے میرے، میرا دل ھی چلا

صاف صندل سے زیادہ وہ ھاتھ
نرم مخمل سے زیادہ وہ ھاتھ

اس کو جوں ھاتھ لگایا میں نے
دل سے بس ھاتھ اٹھایا میں نے

آفت تازہ جو جان پر آئی
یہ غزل اپنی زبان پر آئی

غزل

کیا لگا دست دل آرام سے ھاتھ
دل گیا ھاتھ سے اور کام سے ھاتھ

س غزل نے اسے آگاہ کیا
ھاتھ کو ھاتھ جھٹک کھینچ لیا

هنس کے یوں، صاحب خانہ سے کہا
کہ یہ درمان مرض جانے کیا

کوئی ناداں ہی کہے، اس کو طبیب
درد میں خود ہے گرفتار غریب

ہاں خلل جوش جنوں کا ہے اسے
شرط ہم بدتے ہیں، سودا ہے اسے

پہلے وہ آپ ہنسے یہ کہ کر
پھر تو سب لوٹ گئے قہقہہ کر

یہ امۃ الفاطمہ المتخلص بہ صاحب تھیں، مؤمن نے نبض کیا دیکھی۔ کہ اپنی نبض گم کر بیٹھے، آخر محبت کا جنون بڑھتا گیا، صاحب نے اپنے بندہ کی چارہ سازی کی، لیکن جلد ہی جدائی کے لمحات قریب آ گئے، اور صاحب کی لکھنؤ واپسی ہوئی، مؤمن روئے پیٹے۔ آخر صبر کر بیٹھے، اس طرح اس محبت کا انجام ہوا۔ بقول شیفتہ (ص ۲۳۱ تذکرۂ گلشن بیخار) چند مہینے درد و دوا کا سلسلہ رہا۔ مدتیں ہو گئیں کہ لکھنؤ واپس گئی۔ مؤمن کی مثنوی قول غمیں اسی کی تعریف میں ہے، مؤمن کے فیض صحبت سے شاعری کا ذوق ہو گیا تھا۔ عرشی نے (حیات مؤمن ص ۵۰ تا ۵۳) جو داستان لکھی ہے کہ ایک شخص نے آکر ایک مریضہ کو دیکھنے کی دعوت دی، کوٹھے پر گئے تو اسی حسینہ کو جلوہ گر پایا، جس کو دل دے بیٹھے تھے۔ ادھر صاحب جی کا هٹنا تھا، کہ مؤمن بھی روتے ہوئے گھر چلے آتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد ان کو اپنے علم نجوم سے پتہ لگتا ہے کہ وہ دلّی سے روانہ ہوگئیں اب کدھر کو گئیں، کیا ہوئیں، اس راز کو مقدر نہیں کھلنے دیتا۔ دل یہ تقاضا کر

رہا ہے کہ بی بی لڑکوں کو چھوڑ اورگھر سے نکل... [حیات مومن صفحہ] متذکرہ بالا روایت سر تا پا غلط ہے ، مثنوی قول غمیں سے تفصیلی حالات واضح ہو جاتے ہیں ۔ گھر بار اور بی بی لڑکوں کو چھوڑنے کا خیال عرش صاحب کی ذھنی اختراع ہے صاحب سے محبت ۱۲۳۶ھ میں ہوئی اور خواجہ محمد نصیر کی لڑکی کے ساتھ مؤمن کی شادی ۱۲۴۵ھ میں قریباً نو سال بعد ہوئی ، پھر لڑکے کہاں سے پیدا ہو گئے ۔

۱۲۴۱ھ - ۱۲۴۲ مثنوی تف آتشیں : مؤمن جذباتی انسان تھے۔ ہر وہ تحریک جس میں جوش و خروش کے اظہار کا موقع ملتا وہ شامل ہو جاتے دلی اس وقت دو گروھوں میں تقسیم تھی شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کے شاگردوں کا ایک گروہ بدعات کو شرک قرار دے کر اس کا استیصال فرض عین جانتا تھا اور دوسرا بدعات کو مستحسن اور داخل دین سمجھتا ، مؤمن اول الذکر طبقہ کے ساتھ تھے ، لیکن عقائد میں اس پختگی کے باوجود عشق و محبت کو دین سے بھی بالا جانتے ھیں ، چنانچہ ۱۲۴۱ھ یا ۱۲۴۲ھ میں وہ ایک شادی کی تقریب میں مہتمم تھے ، انتظام کے سلسلے میں بار بار انہیں زنان خانے کی ڈیوڑھی تک جانا پڑتا ۔ اسی میں ایک شوخ حسینہ کو دیکھ کر دل نذر کر بیٹھے وہ بھی بے باک تھی وعدہ وعید ہوئے اور بعد شادی رخصت ہوئی ۔

اپنا گذر جوں صاحب خانہ
تا در رنگیں بزم زنانہ

پردے سے اک آواز خوش آئی
جس نے یہ چپ ہے مجکو لگائی

چلون اٹھا کر ووھیں گرا دی
ایک جھلک سی اپنی دکھا دی

شام کو بارے آنکھ بچا کر
دیکھ گئی اس حال کو آ کر

آ کے تسلی دے گئی کچھ کچھ
تاب و تواں پھر لے گئی کچھ کچھ

کیا کہوں کیا کیا جلوے دکھائے
ووھیں گئے اور ووھیں پھر آئے

روز وداع بزم جو آیا
مژدۂ مرگ تازہ سنایا

اس نے یہ بھی کہا کہ میرے گھر پیغام پہنچنا ناممکن ہے - نگرانی اتنی سخت ہے کہ رات میں بھی تصور ملاقات کا نہیں ہو سکتا، خیر جیتے رہے تو کبھی آن ملیں گے، لیکن مؤمن صبر نہ کر سکے، اس کے مکان پر پہنچے، اور مکان کی نوکرانی کو رازدار بنا کر پیام بھیجا، محبوبہ نے صاف جواب دے دیا ، مایوس ہو گئے، پھر پتہ چلا کہ وہ مؤمن کے ایک دوست کے گھر مہمان آئی ہے، جلد ایک محرم راز بھیجی اور حالت زار بیان کی ، جب پیام سنا تو غصہ سے سرخ ہو گئی ، کہنے لگی دوبارہ نام نہ لینا ، وہ خود تو بدنام ہے اپنے ساتھ مجھے بھی رسوا کرنا چاھتا ہے ، اب ملاقات کی توقع فضول ہے میں کسی صورت بھی نہ ملوں گی، اب حالت اور خراب ہو گئی، ایک دوست نے راز پوچھا، اس سے داستان کہی وعدہ کیا کہ محبوبہ تک پیام پہنچائے گا، جب

محبوبہ کو پیام عاشق مہجور سنایا تو اس نے جواب دیا کہ جب صبر نہ ہو سکتا تھا تو محبت کیوں کی، میرا ملنا آسان سمجھتا تھا، کہیں میں رسوا نہ ہو جاؤں، یا تو وہ مر جائے یا میں۔ آخر مؤمن مایوس ہو گئے نوبت یہ پہنچی کہ کھانا پینا چھوڑ دیا ، صحت جواب دینے لگی ، طبیبوں نے علاج کیا ، لیکن بے سود۔ غالباً اسی موقعہ پر مؤمن کے چچا حکیم غلام حسین خان نے علاج کیا ، چونکہ ایک قطعہ اسی سلسلہ کا اردو کلیات مؤمن (ص ۱۸۰) میں پایا جاتا ہے :

عم بزرگوار کہ ہیں عیسیٰ زماں
نسخہ کا جن کے معجزے سے مشکل امتیاز

سقراط زہر خوردہ کا گر چارہ وہ کریں
عمر خضر سے ہو نفس واپسیں دراز

ازبسکہ زندگی کی توقع نہیں رہی
وہ بھی مرے علاج سے کرتے ہیں احتراز

کیا نار عنصری کے اڑا ڈالیں گے دھوئیں
دل گرمیٔ حرارت عشق جگر گداز

صندل سے درد سر کو ہو کیا، جب تلک جبیں
میں اس کے آستاں پہ نہ رگڑوں بصد نیاز

اس مضمون کا ایک اور قطعہ بھی ہے، جس میں مؤمن اعتراف کرتے ہیں کہ چچا صاحب میری بیماری کو سمجھ گئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اسے سودائے عشق ہے اور یہ شرم کے مارے چھپا رہا ہے (کلیات مؤمن

ص ۱۸۱، ۱۸۲) :

موا جاتا ہوں اب جی میں ہے ، اس بیدرد کو لکھوں
کہ مجکو تختۂ مشق اطبّا کیوں بنایا ہے

نہ یہ سمجھیں سبب نے کچھ علامت سے مرض پاویں
سڑی ہیں آپ، مالیخولیا مجکو بتایا ہے

کوئی کہتا ہے یہ سکتہ ہے نظروں میں ہماری تو
کئی بار احمقوں نے لا کے آئینہ دکھایا ہے

کوئی کہتا ہے روغن دیجیے بادام مقّشر کا
یہ نکتہ مرتے دم استاد نے مجکو بتایا ہے

مگر عمّ فلاطوں منزلت میرے یہ کہتے ہیں
مرض وہ ہی ہے، لیکن شرم کے مارے چھپایا ہے

یہ سودا عشق ہے تیرا یہ تپ سوز غریبی وہ
کہ بے جا گرمئی صحبت نے تیری، جی جلایا ہے

یہ تلخی ذوق کی وہ تلخ کامی ہے کہ حسرت نے
لب شیریں کے بوسے کا مزہ مجکو چکھایا ہے

مؤمن نے اس نئی محبوبہ سے شادی کی مجلس میں ملاقات کا ہونا ظاہر کیا ہے، اسی واقعہ سے ملتا جلتا ایک واقعہ ایک فارسی رقعہ میں ملتا ہے، جس میں مؤمن اپنی صفائی پیش کرتے ہوے دعوی کرتے ہیں کہ وہ خاندانی لحاظ سے اشرف ہیں اور ہمیشہ شرفاً کی مجالست میسر ہوئی ہے، افسوس کہ میری عمر ضائع گئی ورنہ جیسا کہ آپ ظاہر کرتے ہیں اس قسم کی صحبت آپ کے معزز نوکروں کی میسر ہو جائے

تو شکر گذار ہوں چونکہ آپ کی کنیزوں کا تعلق مجھ سے سب سے زیادہ ہے، میں حیران ہوں کہ بدمعاملگی کا الزام کس طرح لگایا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے قبیلے اور خاندان میں ممتاز ہوں.... امیدوار ہوں کہ دوبارہ کسی کام پر نہ لگایا جاؤں۔ قرینہ چاہتا ہے کہ مثنوی چہارم میں اسی واقعہ کا اظہار ہو۔ بہر حال اس مثنوی کا خاتمہ ناکامی پر ہوتا ہے۔

مثنوی پنجم۔ حنین مغموم ۱۲۴۴ھ: ایک طرف تو سید احمد شہید مؤمن کے پیر و مرشد سکھوں کے خلاف تحریک جہاد چلا رہے تھے، مؤمن عقیدت‌مند مریدوں میں سے تھے، مثنوی جہادیہ لکھ کر تحریک جہاد سے سبک دوشی حاصل کر لی۔ اور پھر انہیں حسینان رنگیں ادا پر جان دینے لگے، سابقہ محبوبہ کی جدائی قابل فراموش نہ تھی۔ اس کی فرقت میں جو حالت ہو گئی تھی اس کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

پھر اطبأ نے کیا ترک علاج
چارہ‌سازوں کا پھر اب بگڑا مزاج

ہم نفس ہیں دمبدم گرم فغاں
ناصحوں کی لڑکھڑاتی ہے زباں

رو کے آنسو پوچھتے ہیں بار بار
زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں یار

سوچتے شاگرد ہیں سال وفات
مرثیہ کی فکر ہے شیون کے ساتھ

کون سے شاگرد وہ استاد فن
بے سخن ہے ''دلربا،، جن کا سخن

وحشت و مضطر، کرم، تسکین و یاس
بیخودی میں بھی ھیں بد جن کے حواس

اکبر و عظمت سرافراز سخن
پایه بالاتر برافراز سخن

شیفته سر دفتر اهل قلم
نکتهٔ خاطر نشاں جس کا رقم

یار جانی ، محرم راز نہاں
بے ریا، مونس، کوئی ایسا کہاں

شاگردوں کی دلدھی سے شعر و سخن کی طرف طبیعت مائل ھوئی اور دل کو صبر و قرار آ گیا که محبوبه نے پیام بھیجا :

اب بھی گر کچھ پاس رسوائی کرو
دور یه هنگامه آرائی کرو

کوئی ملنے کی کروں تدبیر میں
هجر میں کب تک رھوں دل گیر میں

مؤمن نے استغنا سے جواب دیا :

گر ملو شکر عنایت کچھ نہیں
اور نه ملئے تو شکایت کچھ نہیں

اس پر اس کی طرف سے پیام آتے رہے، اور آخر ملاقات ھو گئی ، لیکن وہ جوش محبت سرد ھو چکا تھا، اس لیے محبوبه کی مذمت پر اتر آتے ھیں اور اسکی ندائشں حسن کی تضحیک کرتے ھیں بیزاری بڑھنے لگی، اسی زمانے

میں ایک مقام پر چند حسینوں کو دیکھا ان میں سے ایک نے اسیر گیسو دام کر لیا ۔ حنین مغموم میں اسی واقعہ کا ذکر ہے، پھر وہی بیقراری اور سیماب وشی ظاہر ہونے لگی ۔ دن کا چین اور رات کی نیند گئی بہزار دقت اس سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے، اور دونوں طرف آتش محبت بھڑکنے لگتی ہے،لیکن متنفر محبوبہ نے اپنی توھین محبت کا انتقام لیا اور اس سے مل کر مؤمن کی بوالھوسی کی داستان اس انداز میں بیان کی کہ اس نے ملنے سے انکار کر دیا، ھرچند منانے کی کوشش کی، مگر وہ کسی طرح دام فریب میں نہ آئی اس طرح یہ داستان ناکامی پر ختم ھو جاتی ہے۔
اس سلسلے کے چند شعر ھیں (کلیات مومن ص ۳۶۵ تا ۳۷۶) :

اک جگہ وارد ھوا ناگاہ میں
اس خرابی سے نہ تھا آگاہ میں

ان میں اک رشک پری محسود حور
سب بلائیں سی لگیں، جس کے حضور

اس پری رخسار پر دل آ گیا
جلوۂ پنہاں نظر میں، چھا گیا

جانب چلون نظر جو جا پڑی
ایک بجلی تھی، جو جاں پر آ پڑی

میری بے حوشی سے ھوش آیا اسے
خوب خاموشی نے سمجھایا اسے

پردۂ انکار میں اقرار سا
عذر ننگ و نام بےتکرار سا

کہہ دیا سب سے کہ اک راز نہاں
آج پوچھوں گی کہ ہے بیتاب جاں

وہ زبوں طالع کہ ہے اختر شناس
آئے تو، تم بھیج دینا، میرے پاس

جوھیں اس گھر میں ہوا اپنا گذر
آئی کچھ تثلیث زہرہ کی نظر

کر کے استقبال وہ ماہ تمام
لے گئی بارے مجھے بالائے بام

عہد و پیمان وفا باہم ہوے
وعدہ‌ہائے وصل مستحکم ہوے

جب سنی اس بد بلا نے یہ خبر
حال جس کا کہہ چکا ہوں پیشتر

ایک دن وہ آ کے مہماں رہ گئی
بد زباں کیا جانے، کیا کیا کہہ گئی

ملتے ہی باہم جدائی ڈال دی
نیک کے دل میں برائی ڈال دی

مؤمن اس جدائی کے صدمے اٹھاتے رہے، اور اس کا تذکرہ مثنوی آہ و زاریٔ مظلوم میں ہے ۔

آہ و زاری مظلوم ۱۲۳۶ھ : اس مثنوی میں محبوب کی سرد مہری اور بیوفائی کا ذکر ہے اور اس کے مذہب کا بھی حوالہ دیتے ہیں (کلیات مومن ص ۳۷۸ تا ۳۸۳)

نرالا سب سے اس کا کیش و آئیں
محب اہل بیت و دشمن دیں

غضب خوں‌ریز و کافر ماجرا ھے
فضاے خانۂ دشت کربلا ھے

گلے اپنے شہیدوں کے لگے خاک
جسد مردے کا اس مذھب میں ناپاک

مسلمانوں کے حق میں دوزخ اندیش
کہے کفار کو مؤمن، وہ بدکیش

طلسم شیعگی جادو کلامی
صفت میری جو ھو تو نیک نامی

مری الفت چھپائے مجھ سے بے دیں
تقیہ فرض جانے مستحب کیں

وہ بت دیتا ھے طعنہ کس ادا سے
کہ اب تم چاھتے ھو کیا خدا سے

کہاں سے لاؤں وہ پیغام پرداز
کہ ھو اس شوخ کا بھی محرم راز

اس آغاز محبت کا مآل آہ
کہ ھووے وصل سے پہلے وصال آہ

نہ آنا تھا تو کیوں گھر میں بلایا
بٹھا کر پاس یہ فتنہ اٹھایا

خبر پامال غم کی اپنے لو تم
ملے ہم خاک میں، اب تو ملو تم

کہاں اے بدر سیما، وہ ترحم
کہ ہوں میں رازدار سیر انجم

پھر ایک حکایت سناتے ہیں کہ ایک اسیر محبت محبوبہ کے تغافل سے مر گیا اور پھر محبوبہ نے جب کہ وہ فاتحہ پڑھنے قبر پر گئی تھی، وہیں جان دیدی اور قبر میں سما گئی، آگے کہتے ہیں کہ اگر چاہو تو میں ایسے سو قصے سنا دوں، اور اگر کہو تو مر کر دکھا دوں۔ آخر میں کہتے ہیں (ص ۱۰۳ کلیات مومن) :

الہی مؤمن اتنا ناتواں ہے
کہ ذکر اس سنگ دل کا بھی گراں ہے

اسی سال سید احمد شہید معرکۂ بالاکوٹ میں دنیا سے اٹھ جاتے ہیں اور مؤمن بھی اپنے پیر و مرشد کی وفات سے متاثر ہو کر عشق و محبت سے تائب ہو جاتے ہیں، چونکہ اس واقعہ کے بعد مؤمن نے کسی واقعہ محبت کا اظہار اپنی کسی مثنوی میں نہیں کیا ہے۔

آغاز شاعری ۱۲۲۷ھ۔ مؤمن نے اپنی پہلی مثنوی شکایت ستم میں شعرگوئی کا ذکر کیا ہے، اور بارہ سال کی عمر میں محبوبہ سے پیام ملاقات کے جواب میں شعر کہہ کر آنے کا بیان کیا ہے۔ پہلی مثنوی

۱۲۳۱ھ میں لکھی گئی ہے، اور محبوبہ سے ملاقات کئی سال چلتی رہی ہے ۔ اس سے اس قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۲۳۱ھ سے پہلے وہ شعر گوئی میں کافی مہارت رکھتے تھے، اس لیے آخر ۱۲۲۷ھ میں آغاز شاعری ہو سکتا ہے، یہ مدت اس وجہ سے قرار پاتی ہے کہ ۱۲۱۵ھ مؤمن کا سال ولادت ہے اور ۱۲۲۷ھ میں ان کی عمر بارہ سال کی ہو چکی تھی۔ ۱۲۳۱ھ میں محبوبہ سے جدائی ہو جاتی ہے ۔ محبت کا دوسرا واقعہ تین سال سے زیادہ چلا، پہلی محبوبہ سے محبت ۱۲۲۴ھ میں ہوئی ۔ اور دوسری سے ۱۲۲۷ھ میں، ۱۲۲۷ھ سے قبل ترک تعلیم کر چکے تھے، دھلی میں شعر و شاعری کا چرچا عام تھا، اس لیے جو بچہ نو سال کی عمر میں عشق و محبت سے واقف ہو چکا تھا وہ شعر و شاعری سے بھی غالبا اسی عمر میں باخبر ہو چکا ہوگا ۔ اور موزونیت سخن کا زمانہ ۱۲۲۷ھ سے قرار دیا جا سکتا ہے، داغ نے بارہ سال کی عمر میں ایک مشاعرہ میں جو سبقدہ کے یہاں منعقد ہوا تھا غزل پڑھی تھی، ظہیر دھلوی نے بھی اسی عمر میں شاعری شروع کی تھی، غالب نے ستره برس کی عمر سے شعر گوئی شروع کی، مؤمن نے بھی بارہ سال عمر میں شعر و شاعری میں حصہ لینا شروع کیا ۔ چونکہ دوسری محبوبہ سے جدائی پر اپنا حال بیان کیا ہے :

مضطرب سامنے پھروں ناچار
ورد لب اپنے حسب حال اشعار

یہ اشعار جو حسب حال ہوتے ، ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے بھی ہوں، لیکن اپنے شعر ورد زباں ہونا زیادہ قرین قیاس ہیں چونکہ رفتہ رفتہ ان کا ذوق شعر بڑھتا گیا، اور پھر شاعری کا شوق اس حد تک پہنچ

گیا کہ محبوبہ بلا رہی ہے اور مؤمن کہتے ہیں کہ ذرا انتظار کرو میں دو شعر کہہ لوں پھر آتا ہوں، اور یہی شاعری مستقل جدائی کا باعث بنی، یہ واقعہ ۱۲۳۱ھ کا ہے، اس سے مؤمن کا مرتبۂ سخن بھی متعین کرنے میں مدد ملتی ہے، سومن کا بیان سنئے (ص۲۸٦تا۲۸۷) :

شوق کو مشق نالۂ موزوں
باندھتا تھا میں دل کشا مضموں

کہا میں نے کہ رہ کے آؤں گا
ایک دو شعر کہہ کے آؤں گا

دیکھیں آگے دکھائے کیا کیا دن
ہے ابھی سترہ برس کا سن

دوسری مثنوی ''قصۂ غم ۱۲۳۵ھ ،، میں شاعری سے وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے یار باشی کا بھی بیان کرتے ہیں اس وقت مؤمن کی عمر بیس سال تھی ص ۲۹۴ :

دیوانوں سے شوق بے نہایت
اشعار کا ذوق بے نہایت

تصحیح سخن پہ طبع مائل
علم شعرأ میں فرد کامل

بے بذلہ سنی نہ بات کوئی
ختم اس پہ ہوئی لطیفہ گوئی

ہر پیر و جواں سے آشنائی
سارے ہی جہاں سے آشنائی

تیسری مثنوی قول غمیں (۱۲۳۶) میں جب کہ مؤمن کی عمر ۲۱ سال کی تھی، شاعری کا تذکرہ ہے اور زندہ دلی کا بیان ہے (ص ۳۱۶) :

یاروں میں ہنسنے کا غل آٹھ پہر
وقف لب، خندۂ گل آٹھ پہر

زمزمہ ساز برنگ بلبل
نغمہ پرداز، برنگ بلبل

نغمہ سنجی و خوش الحانی و بس
شعر گوئی و غزل خوانی و بس

رات دن ہنسنے ہنسانے کی بات
یاروں سے ملنے میں صرف اوقات

لیکن مؤمن اور بت کافر سے پرہیز ممکن نہ تھا، ایک طوائف امۃ الفاطمہ لکھنئو سے دلی آئیں ان کو نبض کیا دکھائی کہ آفت ڈھائی۔ نبض ہاتھ میں لے کر مؤمن یہ غزل سناتے ہیں (ص ۳۲۰) :

کیا لگا دست دل آرام سے ہاتھ
دل گیا ہاتھ سے، اور کام سے ہاتھ

اسی مثنوی کی تیسری غزل ہے جس سے اتنا طے ہو جاتا ہے کہ یہ غزلیں ۱۲۳۶ھ میں کہی گئی ہیں :

کاکل آشفتہ و پیچاں کیوں ہے
زلف کا حال پریشاں کیوں ہے

(ص ۳۲۵)

چوتھی غزل اس مثنوی کی یہ ہے :

محو دیدار بت کافر ہوں
کیا ہوا، ہائے خدایا مجکو
(ص ۳۲۶)

پانچویں غزل کا مقطع قابل دید ہے :

مؤمن اس بت سے بگڑنا ہی نہ تھا
بن چکی بات خدا سے تیری
(ص ۳۳۴)

۱۲۴۱-۱۲۴۲ھ: چوتھی مثنوی '' تف آتشین،، میں اپنی شعر و شاعری کا حوالہ دیتے ہیں اور موسیقی سے بھی لگاؤ ظاہر کرتے ہیں ۔

جی کو سنبھالا حیلہ و فن سے
دل بہلایا ، شعر و سخن سے (ص ۳۴۰)

سیر چمن میں، روز گذاری
ہم نفس دم ، باد بہاری

رود و شراب و صحبت یاراں
رات کہ عید بادہ گذاراں

طبع کشیدہ، رنج کشوں سے
گرمیٔ صحبت، شعلہ وشوں سے

زمزمہ سازی سے دم سازی
چنگ نوازی، گوش نوازی

۱۲۴۴ھ: مثنوی ”حنین مغموم“ سے مؤمن کی کاملیت فن اور استادی کا اظہار ہوتا ہے مؤمن نے اپنے آٹھ شاگردوں کے تخلص لکھے ہیں یہ شاگرد نہ تھے بلکہ مؤمن کے ہمدم و ہمراز بھی تھے، (ص ۳۰۴ کلیات مؤمن) وحشت، میر غلام علی خان مراد آبادی، مضطر مرزا سنگین دہلوی، کرم غلام ضامن کوتانوی، تسکین میر حسین دہلوی، یاس خیرالدین دہلوی، ادبر محمد، اکبر خان دہلوی، عظمت، میر عظمت اللہ، اور نواب مصطفی خان شیفتہ دہلوی - ۱۲۴۴ھ میں مومن کی شاعری کا اٹھارواں سال تھا، عمر کی تیسویں منزل طے کر رہے تھے، اس سے ایک سال پہلے ان کا دیوان ان کے ساگرد رشید شیفتہ ۱۲۴۳ھ میں ترتیب دے چکے تھے، اتنی جلدی معراج کمال پر پہنچنا مومن کی خدا داد ذہانت ہی کا حصہ تھا، اس کی شاعری کا چرچا صرف دھلی ہی میں نہ تھا، بلکہ شہرت ہمہ گیر ہو چلی تھی، مولوی عبدالقادر رام پوری اپنے روزنامچے (۱۲۴۰ھ ۱۸۲۵ء) میں لکھے ہیں کہ دھلی کے نوجوان شعرا میں مومن خان مومن ہے جس کا یہ مطلع مشہور ہے۔

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں، میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہووے گا، نقشہ تمہارے گھر کا سا

مؤمن کی شہرت کا باعث اس کی حالیہ شاعری تھی، جس پر اسے ناز تھا، دلی کی بزم ادب کے صدر مفتی صدرالدین آزردہ تھے اور مؤمن نواز تھے - غالب اور ذوق کا چراغ مؤمن کے سامنے نہ جل سکا، مؤمن کے شاگردوں سے اس کے کمال شاعری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، غلام علیخان وحشت اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے کمال شاعرانہ کے غالب معترف تھے، اور فارسی میں شیفتہ مؤمن کے مرنے کے بعد جب غالب کے شاگرد ہوئے

تو غالب نے افتخار کا اظہار کیا، تسکین مؤمن کا شاگرد رشید تھا۔ تسکین کا بیشتر کلام ضائع ہو گیا ہے، موجودہ کلام سے بھی اس کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

مؤمن کی همه رنگ اور متلون طبیعت، کسی ایک حال پر رهنا پسند نه کرتی تھی، اس لیے جلد ھی وہ شاعری سے دست کش ہو گئے، چنانچه ۱۲۵۰ھ میں جب که مؤمن کی عمر قریباً ۳۰ سال کی تھی وہ شاعری سے متنفر ہو گئے تھے، شیفته لکھتے ھیں (گلشن بیخار ص ۱۹۶)۔

که کسی محرک کی تحریک کے بغیر مؤمن فکر سخن میں مشغول نہیں ہوتا ہے، چنانچه اس کا اکثر کلام میری تحریک سے ظہور پذیر ہوا ہے، اور اس کے کلام کی تدوین بھی راقم آثم ھی نے کی ہے اور اس کا دیباچه میرا لکھا ہوا ہے، اب ریخته کی جانب بہت کم توجه ہے کبھی کبھی اگر فارسی میں سحر آفرینی کرتا ہے اور احسان فارسی داں اصحاب پر رکھتا ہے۔

مرتبۂ شاعری: مؤمن کی شاعری کے بارے میں شیفته کی رائے ہے (گلشن بیخار ص ۱۹۶):

که میرے گمان میں قوت شاعری میں مؤمن جیسے کم پیدا ہوئے، ہر صنف سخن میں وہ اعلیٰ مقام حاصل ہے که دوسروں کو کسی ایک صنف سخن میں بھی میسر نہیں، اردو اور فارسی میں ایسا شاعرانه کمال ہے که دونوں زبانوں کے باکمال اس کے معترف ھیں، ظہوری ترشیزی نے تین سو سال پہلے یه فرد ان ھی کی تعریف میں کہا ہے:

مناجاتیاں مدح خوان من اند
خراباتیاں خود از آن من اند

شیفتہ مؤمن کے شاگرد تھے اس لیے اس رائے پر شبہ جانبداری کا ہو سکتا ہے، لیکن غالب مرحوم کا اعتراف سنئیے :

هند را خوش نفسانند سخن وز که بود
باد، در خلوت شان، مشک فشان از دم شان

مومن و نیر و صهبائی و علوی و انگاہ
حسرتی ، اشرف و آزردہ بود اعظم شان

مؤمن کے مرنے پر کہتے ہیں :

شرط است که روے دل خراشم همه عمر
خوں نابه برخ ز دیده پاشم همه عمر

کافر باشم اگر بمرگ مؤمن
چوں کعبه سیه پوش نباشم همه عمر

سر سید احمد خان نے ۱۸۴۷ء میں آثارالصنادید ص ۱۹۲ میں اس طرح مدح خوانی کی ہے :

ان کے فروغ ضمیر سے الفاظ دری ، کوکب دری اور ان کی متانت طبع سے، سخن ریختہ، ایوان ریختہ اگر یہ کہا جاوے کہ شیرنیئ زبان حافظ اور نمک سخن سعدی اور متانت تراکیب انوری اور نشست الفاظ خاقانی اور آیاتی عبارات ابوالفضل هندی اور تازگئ معانی کمال‌الدین اصفہانی اور سوا اس کے جو خوبی صنف شعراً سے کسی کے ساتھ مختص ہے سب ان کے کلام معجز میں صرف ہے . . . زبان ریختہ میں وہ کمال مبداء فیاض

سے حاصل ہوا ہے، کہ سودا کو ان کے سخن کے رشک سے جنون ، اور میر ان کے کلام کی خجلت سے سرنگوں ، سخن گوئی کو بحد اعجاز پہنچایا، اور شعر نے ان سے مرتبہ حکمت کا پایا، . . . .

کریم‌الدین تذکرۂ شعرائے اردو (ص ۳۴۴) میں اس طرح رقم طراز ہیں :

اصلاح اشعار کی شاہ نصیر سے انہوں نے لی ہے، مگر در باب فنون نظمیہ کہ خدا نے ان کو وہ بہرہ دیا کہ اپنے استاد شاہ نصیر وغیرہ تمام اقران پر سبقت لے گئے، شعر ان کا بہت اچھا ہوتا ہے۔

صاحب گلستان سخن (ص ۳۴۴) جو معاصر ہیں اور اس کی تالیف میں صہبائی بھی شریک ہیں تفصیلاً رائے ظاہر کرتے ہیں :

سخن سنجان عصر ہرچند بالا دوئی فکر سے عرش‌تاز تھے، لیکن جو کہ یہ والا نگاہ، اپنی ہمت عالی کے اوج سے سب کے احوال پر نگاہ کرتا تھا، ہر سربلند اس کو پست اور ہر بزرگ اس کو خرد نظر آتا اور وہ بے تصنع اس کا نام اسی پندار کے موافق زبان پر لاتا، اور ہرچند مساحان اقلیم کمال، منازل دور و دراز طے کر کے نشیب و فراز راہ سے واقف اور راہ و بیراہہ سخن سے آگاہ تھے، لیکن بسکہ یہ چابک خرام، کمال پیش بینی سے مراحل بیشمار باقی پاتا تھا ان کو کاھل قدم اور شکستہ پا جان کر بے اختیار ریشخند کرتا، اور ان تیز قدموں کو نقش پا سے نارسا تر بتاتا، جو کہ کوتاہ بینان روزگار، اس والا پائیگی اور علو ہمت سے آگاہ نہ تھے، اس کی نگاہ کو عیب بیں

اور اس کی زبان کو خردہ گیر تصور کر کے زبان سرزنش دراز اور طومار شکوہ دراز کرتے . . . . . . ہر چند زبان اردو میں تو علم یکتائی بلند ھی تھا، لیکن کمال مہارت فارسی سے کوس لمن الملک کی صدا نے ہند سے فارس تک پہنچ کر طوطیٔ ہند و بلبل شیراز کو دم بخود کر دیا . . . .

مؤلف گلستان ہمیشہ بہار (ص ۱۱۰) کی رائے ھے :

امروز جنس سخن را در بازار سخن‌وراں ازو رواجے ۔

یادگار شعرأ میں (فہرست اشپرنگر ۔ ترجمہ اردو ص ۹۹ از طفیل احمد) میں ھے :

حکیم محمد مؤمن صاحب اب دلی میں بہترین شاعر اور اچھے طبیب ھیں ۔

آزاد کی یہ رائے بڑی اھم ھے، چونکہ آزاد نے دوسری بار آب حیات میں مومن کے حالات ادیبوں کے اعتراضات کے بعد شامل کئے تھے :

غزلوں میں ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ھیں اور استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی اعلی درجہ پر پہنچایا ھے۔ ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ھیں اسی واسطے جو شعر صاف ھوتا ھے، اس کا انداز جرأت سے ملتا ھے اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے، اشعار مذکورہ میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دلکش تراشیں ھیں، کہ اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ھیں ان کی زبان میں چند وصف خاص ھیں

چن کا حتانا لطف سے خالی نہیں، وہ اکثر اشعار میں ایک شے
کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذات شے کی طرف نسبت
کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لطف بلکہ
معانی پنہانی پیدا کرتے ہیں ۔

جلوۂ خضر میں صفیر بلگرامی (جلد اول ص ۲۳۰، ۲۳۱) کچھ اور تفصیل سے کام لیتے ہیں :

مؤمن خان عاشق تن برشتہ طبیعت تھے . . . . . طبیعت کی وارستگی
اور شوخی نے ان کے کلام میں علم کے ساتھ ضم ہو کر
عجیب مزا پیدا کر دیا تھا ۔ زور طبیعت سے اس نہانی واقعات
اور واردات خاطر کو تو ایسے پیرایہ میں باندھ جاتے ہیں کہ
دوسروں کے لیے کارے دارد، واقعی عجب با مذاق شاعر ہو
گیا ہے جرأت اس رنگ کے موجد تھے، مگر بسبب کم علمی
کے بہت کھل گئے تھے، مؤمن خان کے علم نے ان واقعات کو
مشکل بندش اور پرانی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا،
کہ ادا شناس ہی اس کے مزے کو جانتا ہے، اس سبب سے
اکثر ان کے اشعار کو لوگ بے معنی بتاتے ہیں ۔

ظہر دہلوی شاگرد ذوق داستان غدر میں لکھتے ہیں :

ذوق کی زبان اور پیروی محاورات، مؤمن کے مضامین اور نازک
خیالی و سوز و گداز، غالب کی بندش اور ترکیبات کی تقلید ۔

نساخ (سخن شعرا ص ۴۶۷) کی یہ رائے ہے :

اشعار ان کے پر مضمون و شیریں و عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں۔

راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں گذرا نہیں ۔

صاحب گل رعنا (ص ۳۰۱، ۳۰۲) کہتے ھیں:

حقیقت یہ ھے کہ مؤمن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ھے وہ ان کی ذھانت اور جولانی طبیعت کا تماشاگاہ ھے، قصیدوں میں، غزلوں میں، مثنویوں میں، ھر جگہ ان کا انداز بیان کیفیت سے خالی نہیں، مگر افسوس کہ ان کو مولانا حالی جیسا نقاد نہیں ملا جو ان کی کاوش فکر کے نتائج کو ملک میں نمایاں کرتا، ان کے طرز ادا میں ایک بات اور بھی ھے، جس کو مولانا شبلی نے شعرالعجم میں خصوصیات غالب میں بیان کیا ھے کچھ شک نہیں کہ مرزا غالب بھی ان کے ساتھ شریک ھیں، مگر مؤمن کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ھے کہ اکثر موقوں پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ھیں جن سے ایک خاص لطف پیدا ھو جاتا ھے یہ وہ موقعے ھوتے ھیں جہاں سننے والے کا ذھن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ھو سکتا ھے، یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ھے، جس میں کبھی بے اعتدالی بھی پیدا ھو جاتی ھے، جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ھو جاتا ھے اور اس کے سمجھنے میں کاوش فکر کی ضرورت پڑتی ھے ۔

م بابو سکینہ (تاریخ ادب اردو (ترجمہ)ص ۳۰۹)کا خیال مؤمن کی عری کی نسبت یہ ھے:

مؤمن خان کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرۂ

آفاق ہے، ان کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمہ
ہوتے ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت پیدا کر دیتے ہ
اس میں بلندپروازی کے ساتھ صحیح جذبات نگاری کا جوہر ؛
ہے اور یہی چیز ان کو طرز لکھنؤ سے علیحدہ کر دیتی
عاشقانہ رنگ کے وہ استاد کامل ہیں ان کی علمی لیاقت اور طبا
ان کو معمولی پامال مضامین سے بچاتی ہے۔ مثل غالب کے
بھی کلام میں فارسی کے بہت دلدادہ ہیں، کیونکہ فارسی ہ
ان کو بھی وہی تبحر حاصل تھا بعض وقت یہ فارسی کی کثر
اچھی نہیں معلوم ہوتی اور کلام کو سخت اور گنجلک ؛
کر دیتی ہے . . . . . مؤمن کے یہاں الفاظ کا طلسم ہے اور ا
لفظی ہیر پھیر سے تخیئل کے نئے راستے کھل جاتے ہیں۔

نواب صدیق حسن خان شمع انجمن (ص ۴۴۸) میں نکتہ سنج ہیں :

شاعر قابل بود همیشه پری‌زادان معانی را بدام مبانی صید می کر
و سخن در فارسی و ریخته هر دو می سرائید از شعرای نام
شاهجہان آباد و صاحبان استعداد خداداد است ۔

صاحب تذکرۂ طور کلیم (ص ۹۷) لکھتے ہیں :

بر جمیع اصناف سخن قادر بود از لطایف شعر و شاعری کما ـ
ماهر بقوت سخنوری کم تر کسے برخاسته ـ

بزم سخن کے مؤلف (ص ۱۰٦) اس طرح رقم پرداز ہیں :

پایهٔ ریخته از پستی باوج رسانده اوست، زبانش سحر سامر

می‌نماید و بیانش گرۂ دل بستگی می‌کشاید، غزلیات او لاجواب است و مکتوبات او مغز انتخاب ۔

اسی طرح اس زمانہ کے بڑے ادیب اور بلند پایہ شاعر مومن کے معترف ھیں نیاز فتحپوری نے مؤمن نمبر نگار کا شائع کر کے خراج عقیدت پیش کیا ھے ان کی رائے میں مؤمن جیسا نازک خیال شاعر اردو شاعری میں نہیں ، نسیم دھلوی اور شیفتہ اور تسکین وغیرہ نے ان کے طرز کو ملک میں رائج کر کے مؤمن کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا ۔ اردو شاعری کا دور جدید مؤمن کے شاگردوں سے شروع ھوتا ھے. شیفتہ کے فیض یافتوں میں حالی جیسے نقاد بنے ۔

عقائد اور بیعت : پروفیسر ضیاً احمد، مقدمہ دیوان مؤمن ص۳۰,۳۱ (مطبوعہ شانتی پریس الہ آباد ۱۹۴۷ء) میں لکھتے ھیں مؤمن متشدد اور متقشف نہ تھے ..... وہ ھمیشہ عمل بالحدیث کے قائل اور کتاب و سنت پر عامل رھے اب اختیار ھے کہ جو چاھو مقلدین اور شیعہ پر اکثر اشعار میں چوٹ کرگئے ھیں ..... سید صاحب سے بیعت جہاد کی تھی۔ اور مثنوی جہادیہ لکھی تھی۔ اگرچہ عملی شرکت کا موقع نہ ملا، مولانا فضل حق خیرآبادی سے مراسم تھے، تاھم اختلاف عقائد کی بنا پر بحث ھو جاتی تھی۔ ایک بار دونوں میں مناظرہ ھوا ۔ مؤمن غالب رھے چونکہ مزاج مکدر ھوگیا تھا اس لیے یہ شعر کہہ کر چل دئے :

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مؤمن نہ ھوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ھم

(سولانا فرقتی اور آرزو تخلص کرتے تھے) پھر خود مولانا منانے کو گئے اور بالآخر صلح ہوگئی، جس پر مؤمن نے یہ شعر پڑھا (ارواح ثلاثہ) :

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہوگئے ناچار جی سے ہم

اس کے ساتھ یہ ملحوظ رہے کہ بزرگان دین کی عقیدت و محبت کو وہ ہمیشہ جزو ایمانی سمجھتے تھے۔ اکثر ان کے والہانہ جوش مذہب کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان کے قصائد نعت و منقبت ملاحظہ ہوں۔

عرش گیاوی حیات مؤمن (ص ۵۸, ۵۹) میں ڈاکٹر آیت اللہ بسمل عظیم آبادی کی زبانی روایت کرتے ہیں ۸ :

آپ کے والد اور مؤمن کی دوستی تھی۔ ان کے ساتھ زمانہ طفولیت میں آپ نے مؤمن کو دیکھا تھا۔ آپ کے والد بھی مؤمن کی طرح حضرت علامہ سید احمد بریلوی کے مرید تھے، ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ میں نے مؤمن کی زبانی یہ شعر سنا ہے جو حضرت صاحب کی طرف منسوب ہے مولانا سید احمد بریلوی ''حضرت صاحب،، کے نام سے مشہور تھے، مؤمن اپنے پیر کی مدح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

زمانہ سہدی موعود کا پایا اگر مومن
تو سب سے پہلے کہیو تو، سلام پاک حضرت کا

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ الزام وھابیت مؤمن پر غلط ہے۔ اب یہ کہ ان پر یہ آوازہ کیوں ہوا اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ مؤمن کے قلم نے خرقہ پوشان بے جوہر کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے یہ رباعیاں لکھیں تو اس وقت کے مشایخ جو
اپنے مریدوں سے سجدہ تک حلال ٹھرائے ہوئے تھے،
بگڑ گئے اور دیکھا کہ یہ شخص ڈھولک، ستار، اور قوالی کو
بند کرا دے گا۔ اور مریدآباد سے ایک ٹکا بھی نہ ملے گا۔
اس لئے بہتر ہے کہ لوگوں کو اس کی طرف سے برگشتہ کر دو
ورنہ مؤمن اور ان کا سارا خاندان حنفی مسلک تھا۔

زاد آب حیات میں لکھتے ھیں (ص۴۲۴) :

نیک خیالوں سے بھی ان کا دل خالی نہ تھا۔ نوجوانی ھی میں
مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوئے کہ مولوی
اسماعیل صاحب کے پیر تھے۔ خاں صاحب ان ھی کے عقائد کے
"بھی" قائل رہے۔

ولوی عبدالحی گل رعنا میں وضاحت کرتے ھیں (ص۲۹۸-۳۰۰) :
با ایں ھمہ دینداری کے خیال سے بھی خالی نہ تھے۔ جوانی
ھی میں حضرت سید احمد شہید سعید کے مرید ہوئے اور آخر عمر
تک عقائد میں ان ھی کے پیرو و متبع رہے۔ کلیات میں ایک
مثنوی جہادیہ ہے جو اس وقت لکھی تھی جب سید صاحب
سکھوں سے جہاد کر رہے تھے، علاوہ اس کے دو قطعہ تاریخ
ان کی امامت کے ھیں..... ایک قصیدہ حمد و مناجات میں ہے
ایک نعت میں ایک خلفائے راشدین اور امام حسن اور امام حسین
علیہما السلام کی منقبت میں.....

سیم قریشی اردو ادب کی تاریخ (ص۱۰۵) میں تحریر فرماتے ھیں :

یوں عقائد میں وہ ابتدأ ہی سے بڑے پختہ موحد تھے۔ جوانی
ہی میں سید احمد شہید کے مرید ہو گئے۔

سر سید احمد خاں آثار الصنادید کے باب چہارم (ص۱۹۳) میں صرف
اس پر اکتفا کرتے ہیں :

غازہ پرداز چہرۂ خلق محمدی، مظہر آثار سعادت ازلی۔

کریم‌الدین تذکرۂ شعرائے اردو (ص۳۴۴) میں عقائد سے بحث نہیں کرتا.
البتہ کردار پر روشنی ڈالتا ہے :

ابتدا میں تمام اوقات شعرگوئی اور لہو و لعب دنیا میں صرف
کر کے تمام مزے عیاشی کے اٹھا کر اب توبہ کی بلکہ شعر بھی
کہنا چھوڑ دیا ہے ..... اب پابند نماز و روزہ کے بھی بہ نسبت
سابق کے بہت ہیں۔

نواب سید علی حسن خاں بزم سخن(ص۱۰۶) میں عقیدہ پر روشنی ڈالتے
ہیں۔

و بااین همه برخلاف طائفه شعرأ که بیشتر مشرب آزادگی و وارستگی
پسندیده‌اند عقیدۂ مقبول کیش خود کرده و بر جادۂ مستقیم سنت
پاے عقیدت افشرده۔

حسرت موہانی (تذکرة الشعرأ (ص۱۷) اردوئے معلی ج ۴ نمبر ۵
مئی ۱۹۰۴ء) میں وضاحت پرداز ہیں :

مؤمن نوجوانی ہی میں مولانا اسماعیل شہید کے پیر یعنی مولوی
سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوئے تھے اور اس لیے ان کے

عقائد کے مطابق تقلید و بدعت سے سخت نفرت رکھتے تھے، جیسا کہ اس رباعی اور دیگر مختلف اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

ان تمام رایوں کے جانچنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ مؤمن کے کلام سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جائے اور یہ نتیجہ ہی ہمیں صحیح فیصلے پر پہنچا سکے گا، مؤمن عقائد کے بارے میں مختلف دوروں سے گذرے ہیں ان کا خاندان شاہ ولی اللہی خاندان سے عقیدت رکھتا تھا، محمد مؤمن نام[۳] شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا مجوزہ ہے، اور مؤمن کے کان میں اذان بھی انہوں نے ہی دی۔ مؤمن کا خاندان نہ صرف شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے بھائیوں کا معتقد تھا، بلکہ شاگردی کی نسبت بھی رکھتے تھے، چنانچہ حکیم غلام حیدر خاں کے متعلق آثارالصنادید (باب چہارم ص٦٥ میں ہے:

حکیم غلام حیدر خاں ارشد تلامذۂ حکیم شریف خاں سے ہیں مقامات کتب طب موافق زعم راقم کے جیسے ان کی خدمت میں حل ہوتے ہیں غالب تو یہ ہے کہ اس جزو زمان میں اور کہیں نہ ہوتے ہوں۔ خدمت اساتذۂ کرام مثل مولانا، مخدومنا مولوی عبدالعزیز دہلوی اور مولوی رفیع الدین اور مولوی عبدالقادر صاحب ارفع اللہ درجاتہم سے سالہا سال استفادہ کیا، [۴] اور انواع فیوض حاصل کیے۔

مومن کے دوسرے چچا حکیم غلام حسن خاں بھی حکیم شریف خاں کے شاگرد تھے۔ سر سید احمد خاں کے بقول (آثارالصنادید، ص٦٦) :

ان کے انتقال کو چند سال ہوئے کہ ان کے مکان پر آخون شیر محمد محدث رہتے تھے، جو شاہ عبدالقادر صاحب کے شاگرد اور

مولانا محمد اسمعیل شہید کے ہم درس تھے اور شاہ غلام علی صاحب
کے خلیفہ تھے۔ اور حج کے ارادے سے روانہ ہوئے تھے کہ
راستے میں ۲۹ صفر ۱۲۵۷ھ کو دنیا سے سدھار گئے۔

شاہ غلام علی صاحب کے خلیفہ بزرنگ ابوسعید صاحب اور احمد سعید صاحب میلادالنبی میں قیام کے قائل تھے۔ شاہ غلام علی صاحب کا مسلک حنفی اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے مسلک سے متفق تھا۔ آخون شیر محمد کا مؤمن کے چچا کے یہاں کا قیام اس کو ظاہر کرتا ہے کہ مؤمن کا خاندان خالص حنفی تھا۔ سر سید احمد کا بیان مؤمن کے چچازاد بھائی حکیم عبدالحکیم خاں خلف حکیم غلام حسن خاں کے متعلق (آثارالصنادید ص۶۸) ہے:

کتب درسیہ مولوی شیر محمد سے تمام کی تھیں۔

ان بیانات سے مؤمن کے خاندان کی عقیدت شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب سے ثابت ہوتی ہے نیز شاہ غلام علی کے خلیفہ آخون شیر محمد ان کے چچا کے یہاں مقیم تھے۔ اور اس طرح تقلید کی زنجیریں کڑی تھیں۔ مؤمن نے شاہ عبدالقادر صاحب سے ابتدائی کتابیں پڑھیں یہ روایت درست معلوم ہوتی ہے۔ مؤمن کے خصوصی احباب میں سے مولوی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور دھلی جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد اور حنفی مسلک کے رہنما تھے۔ ان کے دست راست مولوی رشیدالدین خاں صدر مدرس مدرسۂ دھلی تھے، جو شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے شاگرد تھے اور حنفی عقائد میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے جانشین شمار ہوتے۔ دوسرے ساتھی مولوی فضل حق صاحب

خیر آبادی تھے، جو فلسفہ میں امام مانے جاتے ھیں۔ مختلف علوم درسیہ کی تکمیل اپنے والد مولوی فضل امام سے کی تھی اور علم حدیث میں شاہ عبدالقادر صاحب سے سند رکھتے تھے۔ اور شاہ دھومن کے مرید تھے دھلی کے عوام و خواص کی باگ ڈور ان ھی اکابرین کے ھاتھوں میں تھی۔ ان کے خلاف دوسرا گروہ دھلی میں جو شرک و بدعت کے خلاف جہاد کرنے اٹھا تھا۔ مولانا عبدالحی صاحب شاگرد و داماد شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولانا اسمعیل شہید برادر زادہ شاہ عبدالعزیز صاحب خلفاے سید احمد شہید ھیں سید احمد شہید شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت تھے۔ اور شریعت محمدی کے احیاء کے لئے علم جہاد بلند کیا تھا۔ مولانا عبدالحی اور مولانا اسماعیل شہید نے سب سے پہلے دھلی میں بدعات مٹانے کا تہیہ کیا اور کچھ مدت میں اسقدر کامیابی حاصل کرلی کہ دھلی کی جامع مسجد میں جہاں جمعہ کے روز سامان صحن مسجد میں فروخت ھوتا تھا وھاں نماز جمعہ عید جیسی ھونے لگی، ان کی مخالفت میں مولانا فضل حق صاحب اور مولانا رشیدالدین خاں پیش پیش تھے اور آزردہ در پردہ حامی تھے۔ اس سے دھلی کی مذھبی کشیدہ فضا کا اندازہ ھوتا ھے فریقین آپس میں یگانگت اور دوستی کے باوجود دو طبقوں میں تقسیم ھو گئے تھے۔

مومن کا مشرب : مؤمن ان مذھبی مناقشوں سے دور رہے۔ وہ وسیع المشرب تھے، شیعہ سنی، مقلد اور غیر مقلد ان کے دوست تھے۔ شیفتہ جس کی دوستی پر تمام عمر ان کو ناز رھا، سب سے پہلے شاہ محمد اسحاق صاحب سے بیعت ھوے اور ان کی ھجرت پر شاہ ابوسعید صاحب فوت (۱۲۴۹ھ) اور شاہ احمد سعید صاحب خلفاے شاہ

غلام علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر استفادہ فیوض باطنی کرتے رہے، آخر میں شاہ عبدالغنی صاحب خلف شاہ ابوسعید صاحب سے تجدید بیعت کی (مقدمہ کلیات شیفتہ و حسرتی مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۱۹ء از مولانا نظامی)، شاہ احمد سعید صاحب کا مسلک سید احمد شہید صاحب کے خلاف تھا، (متوفی ۲ ربیع‌الاول ۱۲۷۷ھ ص ۲۰ مدفن مدینہ منورہ تذکرۂ کاملان رامپور) ان کی تالیفات حق‌المبین فی رد علی الوھابیین، الفوائد الضابطہ فی اثبات الرابطہ اور الذکرالشریف فی دلائل المولد المنیف سے اختلاف عقائد کا اندازہ ہوتا ہے۔ غایتہ المرام فی تحقیق المولد و القیام لتعظیم سیدالانام، مطبوعہ مطبع علوی لکھنؤ ۱۲۷۱ھ (ص ۲۹ و ۳۰) میں فتویٰ نسبت تعین یوم مولد شریف درج ہے اور مختلف علمائے کرام کی مہریں ثبت ہیں۔ اس پر محمد بہادر شاہ ابوظفر سراج‌الدین سنہ حدٰی مفتی صدرالدین خاں، شاہ احمد سعید صاحب، حکیم محمد احسن‌اللہ‌خاں وغیرہ کی مہریں ہیں۔ سوال نسبت (ص ۳۸) عمل مولد شریف درماہ ربیع‌الاول کے تحت محمد صدرالدین - ربیع‌الاخر ۱۲۶۵ھ۔ فقیر احمد سعید احمدی وغیرہ کی مہریں ثبت ہیں - ص ۸۲ پر ایک فتویٰ ہے:

استفتائے دیگر درباب قیام نولد (جواب عربی میں ہے)

سب سے پہلی مہر ''محمد فضل الحق،، کی ہے، مولوی فضل حق خیر آبادی نواب محمد سعید خاں کے عہد میں رجب ۱۲۶۵ھ میں حاکم مرافعہ اور نگران مدرسہ عالیہ بجائے مولوی عبدالقادر خاں غمگیں مقرر ہوئے تھے - دوسری مہر مفتی شرف‌الدین رام‌پوری (متوفی ۱۲۶۸ھ اسکے بعد دوسرے علمائے رام‌پور کی مہریں ہیں۔ اسی طرح مولانا

محبوب علی نے فتویٰ لکھا کہ تعدد جمعہ جائز نہیں۔ مولانا محمد مظہر کریم نے شاھجہانپور میں ماہ رمضان ۱۲۵۹ھ میں اسپر تنقید کی اور تعدد جمعہ ثابت کیا ص۱۳۹ پر علمائے رامپور محمد فضل حق مہر ۱۲۳۷ھ۔ مفتی شرف الدین مہر ۱۲۵۴ھ کی مہریں ھیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ھے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی مفتی صدرالدین خاں اور شیفتہ ایک ھی مسلک کے افراد تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ مؤمن کے حامی تھے اور غالب کے کلام کا مذاق اڑاتے، جب مولوی فضل حق خیرآبادی نے بھی غالب کے کلام پر تنقید کی تو ان کی تنقید کو خلوص پر مبنی سمجھ کر غالب نے اپنا کلام انتخاب کے لیے سپرد کر دیا۔ اس لیے یہ مسلک کا اختلاف اگر حقیقت رکھتا تو مؤمن کی شاعری عروج کو نہ پہنچتی، مومن کو شیفتہ نے ابھارنے کی کوشش کی۔ اور اس کی کوشش کامیاب بھی رھی مؤمن کی حیات میں غالب کو اپنا صحیح مقام نصیب نہ ھو سکا۔ اور اس کی شاعری درخور اعتنا نہ سمجھی گئی۔ مذھبی اختلافات کی حالت میں مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکانات کی مجالس علمی مؤمن کا کس طرح پروپیگنڈا کر سکتی تھیں۔ دھلی میں یہی دو مکان شعرأ اور ادبأ کی امیدوں کا مرکز تھے۔ اور دونوں مؤمن کے حامی۔ اس روشنی میں ھمیں مؤمن کے عقیدے کو پرکھنا ہوگا کہ جن رباعیات پر تذکرہ نگاروں نے بنیاد رکھ کر مؤمن کو عامل بالحدیث قرار دیا ھے وہ کہاں تک درست ھیں۔ ایسی رباعیات الحاق تو نہیں۔

مؤمن نے ہوش سنبھالا بھی نہ تھا کہ عشق و محبت کے مصائب جھیلنا پڑ گئے۔ ابتدائی تعلیم شاہ ولی اللهی گھرانے کے زیر اثر

تھی اور وھی اثرات اس پر غالب رھے - یعنی مؤمن نے بھی اسی مذھبی
ماحول میں تعلیم پائی - وہ شرک و بدعت کی بحث سے ناواقف تھ
۱۲۱۵ھ اس کا سال ولادت ھے اور ۱۲۳۱ھ تک وہ داد عیش
نشاط دیتا رھا - اس عرصه میں کتب درسیه کے علاوہ علم طب اپنے
والد حکیم غلام نبی خاں اور چچا حکیم غلام حسن خاں اور حکیم
غلام حیدر خاں سے حاصل کیا - اور ان ھی کے مطب میں
نسخه نویسی بھی شروع کردی - شاعری کے لیے شاہ نصیر پر نظر پڑی
لیکن چند ھی دن میں طبع دشوار پسند نے سلسله تلمذ توڑ دیا - او
روش عام سے ھٹ کر نظام‌الدین ممنون کی طرز خاص پر چلنے کی جگہ
علیحدہ طرز ایجاد کی - شطرنج میں کرامت علی خاں سے استفادہ کیا
اور فنون موسیقی مشاھیر فن سے استفادہ کیے - اس طرح وہ چھوٹی عمر میں
ھر فن میں مہارت حاصل کر گئے - علم نجوم اور تعویذ نویسی ک
دشوار تھی ، وہ بھی اختیار کر کے مجالس فن میں حصه لینے لگے -

سید احمد شہید شاہ عبدالقادر کے شاگرد اور شاہ عبدالعزیز کے
مرید تھے - جب وہ مئی یا جون ۱۸۱۸ء (مطابق رجب یا شعبا
۱۲۳۳ھ) میں دھلی واپس آئے - تو فیوض باطنی کا دروازہ کھل گیا - پہلے
مولوی محمد یوسف صاحب پھلتی نبیرہ شاہ اھل‌اللہ (برادر اکبر شاہ ولی اللہ
سید صاحب سے بیعت ھوئے پھر مولوی عبدالحی اور اسی دن شاہ اسماعیل
بیعت ھوگئے ، ازاں بعد شاہ اسحاق - شاہ یعقوب..... نے بیعت کی (سید احمد
شہید - از غلام رسول مہر ص۱۱٦ و ص۱۱۸) ان اکابر علم کی بیعت نے
وقت کے اکثر اصحاب کی توجه سید صاحب کی طرف پھیر دی - دور دور سے
لوگ بیعت کے لیے پہنچنے لگے -

سہر صاحب کی رائے ہے کہ ۴ شعبان ۱۲۳۴ھ (مطابق ۲۹ مئی ۱۸۱۹ء) کو سید احمد صاحب دھلی سے رائے بریلی روانہ ہوئے اور پھر شاہ عبدالعزیز صاحب سے ان کی تا زندگی (وفات ۷ شوال ۱۲۳۹ھ) کوئی ملاقات نہ ہوئی (ص۱۲۹ و ص۳۲۷) اور پھر جہاد کے لیے روانگی بھی رائے بریلی سے ہوئی (۷ جمادی‌الثانی ۱۲۴۱ء) ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء کو روانہ ہوئے اور گوالیار، ٹونک، اجمیر وغیرہ ہوکر حیدرآباد سندھ (۵ ذی قعدہ ۱۲۴۱ھ ص۲۸۲) پہنچے۔

اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ مؤمن نے سید احمد شہید سے بیعت مئی ۱۸۱۸ء اور ۲۹ مئی ۱۸۱۹ء کے درمیان کی، جب کہ ان کی عمر انیس یا بیس تھی۔ اور اس وقت عیش و عشرت میں وقت برباد کر رہے تھے، مؤمن جذباتی انسان تھے، جب اھل علم کے ایک طبقہ نے بیعت کی، مؤمن بھی شریک بیعت ہوگئے، لیکن ایک ایسے مرشد کی بیعت جو طریقہ محمدیہ میں بیعت کر کے عملی اسلامی زندگی کا مطالبہ کر رہے تھے ان جیسے وارستہ مزاج عاشق کے لیے بےفائدہ تھی۔ اس لیے کبھی کبھی جذبات میں بہہ کر کوئی کام کی بات کہہ جائیں تو کہہ جائیں ویسے وہ مذھبی معاملات سے قطعا آزاد تھے۔

قصیدہ نعتیہ میں اس شعر کو پڑھیے اور عقیدہ کا اندازہ لگائیے۔

اگر کہے مددے یا محمد عربی
صفیر مرگ ہو رستم کو نعرۂ لاکوس
(ص۱۴)

حضرت عمر کی منقبت میں جو قصیدہ ہے اس میں وہ اپنی حدود سے

تجاوز کر کے مخالفوں کو لتاڑتے ہیں:

وہ شوخ بے سبب آرار و بے گنہ خوں ریز
کہ جرم قاتل عثمان کا نہ ہو قائل
وہ نکتہ دان کہ تقیّد کو اصل دین کہے
دم شکایت عاشق نہ ہو جفا سے خجل
وہ دور بیں کہ خدا پر کرے "بدا" ثابت
نہیں ہے غیر زبس اعتماد کے قابل
معاندو جو کہا خاتم رسالت نے
کہ میرے بعد نبوت کے تھا عمر قابل
یہی خلافت راشد کی، اس کو بس ہے دلیل
یہی امامت برحق کی اس کو بس ہے سجل

(کلیات مؤمن ص۲۳)

اور حب اسداللہ غالب، علی ابن ابی طالب کی منقبت میں قلم اٹھاتے ہیں تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں:

آئی ہے لب پہ مدح خداوند ذوالفقار
لے جاؤ منکروں کے لیے ارمغان تیغ
شیر خدا علی کہ شجاعت سے جس کی ہے
سر پنجۂ اسد پہ زنخ زن بنان تیغ

(ص۳۱)

اسی طرح حضرت حسن کی منقبت میں نغمہ سنجی کرتے ہیں:

سبزہ رنگی نے تری قتل کیا ہے ظالم
یاد آتا ہے مجھے حال امام مظلوم

افضل الناس حسن ابن علی، سبط نبی
سید و سرور و مولا و مطاع و مخدوم

شبہ کیا، عصمت لحت جگر احمد میں
جب مسلم ہو کہ معصوم ہے جزو معصوم

السلام اے روش‌آموز طریق اسلام
السلام اے خضر جادۂ جنت ملزوم

(کلیات مومن ص۳۴-۳۵)

قدسی کی مشہور غزل کی مؤمن نے بھی تخمیس کی ہے۔ مفتیان ادب جو مؤمن کو تقلید سے بیزار اور عامل بالحدیث قرار دیتے ہیں وہ حسب ذیل دو بند پڑھ کر فیصلہ کریں:

ہوں تو عاشق، مگر اطلاق یہ ہے بےادبی
میں غلام اور وہ صاحب ہے میں امت، وہ نبی

یا نبی یک نگہ لطف، بامی و ابی
مرحبا، سید مکی، مدنی العربی

دل و جاں باد فدایت، چہ عجب خوش لقبی

مظہر نور خدا، شکل ہے محسود صنم
محو تیرے ملک و حور و پری و آدم

کیا ہی عالم ہے کہ تصویر ہی کا سا عالم
من بیدل بہ جمال تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

ظاہر ہے کہ مؤمن جیسا یار باش آدمی خشک مزاج نہیں ہو سکتا، اس کا رنگ کلام بتا رہا ہے، کہ سید احمد شہید کی بیعت کے بعد بھی مؤمن کا نعرہ یہی تھا :

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی یعنی وعدہ نباہ کا ، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(ص۱۳۳)

پھر لطف یہ ہے کہ مؤمن کی مثنویوں کی تاریخوں سے ۱۲۴٦ھ تک داستان محبت کا سلسلہ چلنا ثابت ہے اور اسی سال سید احمد صاحب خلعت شہادت سے سرفراز ہوتے ہیں اس کے علاوہ شیفتہ نے گلشن بیخار میں (ص۱۹٦ ، ۱۹۷) ۱۲۵۰ھ میں لکھا ہے :

کہ یاران رنگیں اور شاہدان شیریں کی ملاقاتوں میں زندگی گذار رہا ہے

ایسے رنگیں مزاج رند مشرب کو زاہد خشک بنا دینا، حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔

اب سوال ان رباعیوں کا رہ جاتا ہے، جن کی وجہ سے ارباب علم غلط فہمیوں میں مبتلا ہوئے۔

ہماری نظر سے چند مخطوطے اور مطبوعہ نسخے دیوان مؤمن اور کلیات مؤمن کے گذر چکے ہیں ان کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں :

(ا) دیؤان مومن مخطوطہ ص۵٦۴ مملوکہ رضا لائبریری رامپور۔

اس نسخہ کے ساتھ دیوان غالب کے بھی کچھ اجزا شامل ہیں۔

عرشی صاحب ناظم رضا لائبریری کی رائے میں یہ نسخہ مؤمن کا اصلاح شدہ ہے، چونکہ حاشیہ پر اصلاحین موجود ہیں اس کی جلد کے ساتھ کچھ سادہ اوراق ہیں، جن پر ۱۲۰۱ھ سے ۱۲۰۴ھ تک کے حسابات درج ہیں اس لیے یہ نسخہ ۱۲۰۱ھ سے پہلے ہی کا معلوم ہوتا ہے، اس دیوان میں یہ غزل بھی شامل نہیں ہے:

دلّی سے رام‌پور میں لایا جنوں کا جوش
ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

حاشیہ پر دوسرے قلم سے مولوی سید احمد شہید کا مدحیہ قطعہ مصرع:

امام برحق مہدی نشاں علی فر ہے۔ درج ہے

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی (۱۲۳۹ھ) اور مؤمن کے والد حکیم غلام نبی خاں (۱۲۴۱ھ) اور مؤمن کی دادی (۱۲۳۷ھ) کے تاریخی قطعات وفات اور عباس علیخاں بیتاب کی شادی کا تاریخی قطعہ (۱۲۴۶ھ) حاشیہ پر درج ہیں، اس سے اتنا واضح ہوتا ہے کہ یہ نسخہ (۱۲۳۹ھ) سے پہلے کا مرتبہ ہے، اس نسخے میں ستتر (۷۷) رباعیات ہیں، عقائد سے متعلق صرف یہ رباعی اس نسخے میں ہے:

یہ چند منافق سراپا بدعت
ہے کفر و ضلال و فسق، جن کی طینت
بتلاتے ہیں بدعتی، امام حق کو
گویا کہ جہاد ہے خلاف سنت

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ امامت جہاد کے بعد یہ رباعی کہی گئی - مولانا غلام رسول مہر اس کی تاریخ ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ (مطابق ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء) بتاتے ہیں (سید احمد شہید ص۲۷۳) اس روشنی میں نسخہ میں ترمیم و اضافہ ۱۲۴۲ھ تک ہوتا رہا، اس نسخہ میں مندرجہ ذیل رباعیاں نہیں ہیں :

یہ کچھ رہ سنت نہ طریق توحید
پھر کیا ہے ضرور سب کی یکساں فہمید
ہم سمجھے ہیں معنی حقیقی یعنی
حیواں ہیں حقیقت میں، یہ اہل تقلید

ارباب حدیث کا میں فرماں بر ہوں
تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں
مقبول، روایت ائمہ، نہ قیاس
یعنی کہ فقط مطیع پیغمبر ہوں

ہے بسکہ محبت رسول مختار
مذہب کو میں سوچتا ہوں۔لیکن ہر بار
آتا ہے قیاس میں حق اہل حدیث
ہر چند قیاس سے نہیں ہے سروکار

کیا سخت تھے ابن سعد، اور ابن زیاد
اولاد نبی پہ ہے ستم، یہ بیداد

فریاد امام کی کسی نے نہ سنی
اللہ سنے مقلدوں کی فریاد

مردک نے شہنشاہ سے بیعت چاہی
گم راہ نے کس راہ سے بیعت چاہی
مصداق ہوا معنئی تبت کا یزید
فرزند یداللہ سے بیعت چاہی

خالص ہوں محمدی مرا دین اسلام
گو رائے صواب ہو نہیں مجکو کام
تقلید کی ٹھیری تو بنوں گا شیعہ
کس واسطےچھوڑ دیجے، افضل‌تر امام

(ب) دیوان مؤمن مخطوطہ ۷۰۴ رضا لائبریری رام پور، اس نسخے میں نواب محمد سعید خاں کی مسند نشینی (۲۰ اگست ۱۸۴۰ء ۲۱جمادی‌الاخر ۱۲۵٦ھ)

والا قطعہ :

رام‌پور اک زمان ممتد سے
تیرے مقدم کا تھا تمنائی

شامل نہیں ہے۔ البتہ سہسوان کے سفر سے متعلق اشعار ہیں (۵۵) رباعیاں اس مخطوطہ میں شامل ہیں مذکورہ بالا پانچ رباعیاں آخرالذکر نہیں ۔ البتہ پہلی رباعی موجود ہے۔

(ج) - کلیات مؤمن مخطوطہ ۸۰۵ مکتوبہ عبدالرحمن آھی متبنٰ
مؤمن (خلف میر حسین تسکین) (۱۵ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ) میں یہ رباعی
درج نہیں -

(د) دیوان مؤمن - مطبوعہ مطبع رفاہ عام دھلی، محلہ قاضی حوض
گذر الہ آباد، ۱۱ فروری ۱۸۴۶ء - یہ دیوان مولوی کریم الدین
مؤلف تذکرۂ شعرائے اردو نے مؤمن کی وفات سے چھ سال پہلے
شائع کیا تھا -

(و) - دیوان مؤمن مطبوعہ انڈین پنچ - باھتمام منشی دیبی سہا۔
(غالباً مطبوعہ ۱۸۵۵ء)

نسخہ (د) اور (و) میں بھی یہ پانچ رباعیاں موجود نہیں، ان رباعیوں کی اشاعت کلیات مؤمن مطبوعہ مطبع نول کشور ۱۲۸۴ھ میں پہلی مرتبہ ھوتی ھے - اس کے آخر میں عبدالرحمن آھی کا ایک دیباچہ شامل ھے اور یہ دعوی کیا گیا ھے کہ یہ نسخہ مؤمن کے مرنے سے پیشتر آھی نے مؤمن کی نظر سے گذار دیا تھا - اور مصنف کا تمام کلام اس میں درج ھے، ھم ان رباعیوں کو تسلیم کر لیتے، اگر مؤمن کی حیات میں یہ رباعیاں شائع ھو جاتیں - شیفتہ نے پہلی مرتبہ دیوان مؤمن ۱۲۴۳ھ میں ترتیب دیا اور واضح کیا کہ مؤمن کی دشوار پسند طبع نے کچھ حصہ حذف کر دیا ھے اور کچھ اضافہ کیا ھے، اس لیے کہ باغبان کے لیے تراش خراش ضروری ھے اور مشاطہ آرائش کے اصولوں کے برتنے پر مجبور ھے اس لیے اس کے بعد جو کچھ مؤمن کے نام پر دیکھا جائے اس کا کلام نہ سمجھا جائے - اسی نسخہ کی

اشاعت کریم‌الدین نے تقریباً بیس برس بعد ۱۲۶۲ھ میں کی۔ اگر یہ رباعیاں مؤمن کی ہوتیں تو ان کی اشاعت کیوں گوارا نہ کی۔ مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر ہم مؤمن کو مقلد اور غیرمقلد کی بحث میں کیوں الجھائیں ۔

حکیم احسن‌اللہ خاں، بہادر شاہ ظفر کے وزیر، مؤمن کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اور مؤمن کی فارسی رقعات سے ان کی عظمت اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے، شیفتہ کی دوستی پر موسن کو ناز تھا، اور شیفتہ مؤمن کے مربی بھی تھے۔ وہ دوستی کے پردے میں ان کی امداد بھی کرتے تھے، جس کا سلسلہ مؤمن کے مرنے کے بعد بھی احمد نصیر خاں (پسر مؤمن) کے ساتھ جاری رہا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ کی ایسی ذات تھی، جن کی پوری دھلی مداح تھی۔ وہ حسب ھدایت ھر ایک کا کام نکالتے۔ ان کی علمیت کو شاعری نے ڈبویا (روزنامچہ مولوی عبدالقادر خاں) غالب نے ان کی تعریف میں قصیدہ لکھا اور سر سید احمد خاں انکے متعلق لکھتے ھیں :

هزار بار بشویم دهن ز عطر و گلاب
هنوز نام تو بردن کمال بے ادبی است

غلام علی خاں وحشت، جو مؤمن کے شاگرد ھیں اور مخلص دوست بھی، وہ مولوی رشیدالدین خاں (شاگرد شاہ عبدالعزیز محدث) کے شاگرد اور داماد تھے۔ (مولوی رشیدالدین خاں نے مولوی عبدالحی اور شاہ اسماعیل شہید کی مخالفت میں کافی حصہ لیا تھا) ان قریبی احباب کے اور شاگردوں کے عقائد مذھبی قطعاً جدا تھے، یہ سب اصحاب مقلد اور حنفی تھے، ایسے احباب کے عقائد پر ایسا سخت حملہ کرتے ”حیواں ھیں

حقیقت میں یہ اہل تقلید ۔،، مؤمن جیسے وسیع المشرب سے قطعاً بعید ہے ۔ وہ شیعہ محبوباؤں کی بےوفائی کے سلسلے میں لطیف انداز میں اشارۃً اور کنایۃً طنز کرتے ہیں، لیکن دل آزاری کسی حد تک نہیں ۔ ظاہر ہے کہ مومن کٹر ملّا نہ تھے ورنہ نواب وزیرالدولہ والی ٹونک کی دعوت حج کے سلسلہ میں اس طرح معذرت نہ کرتے ۔

حامل دفتر مدیح سے ہوں
مجھے پہنچا تھا علم اذ عالی

کہ نہیں کیوں خیال طوف حرم
مومن اور اتنی نا مسلمانی

تجھے معلوم کیا نہیں ناداں
فرض ہے حج بہ نص قرآنی
(ص ۰ ۴)

ہے مجھے بھی خیال طوف حرم
خضر رہ گر ہو فضل رحمانی

ہے ابھی آرزوے وصل صنم
ہے ابھی حسرت ہوس رانی

فکر انجام سد راہ ہوئی
سن چکا ہوں حدیث صنعانی

(ص ۱ ۴)

کہیں کہیں وہ جذبات کی رو میں بہہ گئے ہیں اور نہایت حقارت آمیزانہ طور پر بعض مشاہیر پر حملے کئے ہیں خواجہ فرید کی ریش

تراشی کا قطعه تاریخ بڑے شد و مد سے لکھا ھے اور دل کے پھپھولے پھوڑے ھیں، لیکن سر سید احمد خاں نے آثارالصنادید میں مؤمن کی تعریف کے دریا بہا دیے ھیں، اس سے مؤمن کی جرأت رائے کا اندازہ ھوتا ھے :

ریخته چغد جہنم آشیانی بال و پر (دیوان مخطوطه فارسی) -

البته دیوان مؤمن کی پہلی غزل یه ظاهر کرتی ھے کہ جس وقت ۱۲۴۲ھ میں سید احمد شہیدؒ نے بیعت ''امامت و جهاد،، کی لی اس کے بعد یه غزل کہی گئی اور شیفته نے ۱۲۴۳ھ میں جب دیوان مرتب کیا تو نیا کلام بھی شامل ھوا۔ اس غزل سے عقائد کی وضاحت ھوتی ھے -

فروغ جلوۂ توحید کو وہ برق جولاں کر
کہ خرمن پھونک دیوے، هستی اهل ضلالت کا

مرا جوهر هو سر تا سر، صفاے مہر پیغمبر
مرا حیرت زدہ دل، آئینه خانه هو سنت کا

مجھے وہ تیغ جوهر کر کہ میرے نام سے خوں هو
دل صد پارہ اصحاب نفاق و اهل بدعت کا

خدایا لشکر اسلام تک پہونچا کہ آ پہونچا
لبوں پر دم بلا ھے جوش خوں شوق شہادت کا

نه رکھ بیگانه مہر امام اقتدا سنت
کہ انکار آشنائی کفر ھے اس کی امامت کا

امیر لشکر اسلام کا محکوم ہوں یعنی
ارادہ ہے مرا فوج ملائک پر حکومت کا

زمانہ مہدئی موعود کا پایا اگر مؤمن
تو سب سے پہلے کہیو تو سلام پاک حضرت کا

لیکن مؤمن کا یہ جوش صرف زبانی تھا ، جس سال (۱۲۴۱ھ) میں سید احمد شہیدؒ سکھوں کے خلاف جہاد کے لیے نکلے ، تو مؤمن ایک شادی کی تقریب میں آنکھ لڑا بیٹھے۔ اور ''مثنوی تف آتشیں،، وجود میں آئی۔ ۱۲۴۴ھ میں جبکہ مجاہدین، مخالفین سے جنگ آزما تھے۔ مؤمن ایک اور حسینہ کے دام محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں (مثنوی حنین مغموم)۔ اور پھر ۱۲۴۶ھ میں جو سید احمد صاحب کا سال شہادت ہے کسی نئی محبوبہ کا قصہ غم سناتے ہیں (فشار غموم)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آرزوے جہاد کی سچی خلش نہ تھی ورنہ ملک کے ہر حصہ سے مجاہدین جوق در جوق شریک ہو رہے تھے پھر مومن کے لیے کونسی رکاوٹ تھی۔ جوانی کی عمر تھی رگوں میں خون دوڑ رہا تھا ، علم دین کا پاس اس کا مقتضی تھا کہ مؤمن اس کار خیر میں نمایاں حصہ لیتا، لیکن وہ چند شعر کہہ کر فریضۂ جہاد سے سبک دوش ہو جاتا ہے۔ پھر جب کہ نواب وزیرالدولہ والئی ٹونک کی جانب سے فریضۂ حج کی ترغیب دلائی گئی (آغاز عہد حکومت آخر ۱۲۵۰ھ) تو مؤمن نے، آرزوے وصل صنم کا اظہار کر کے جان بچالی۔ شیفتہ کے بقول ۱۲۵۰ھ میں وہ رنگیں مزاجی میں زندگی گذار رہا تھا ، اس لیے مؤمن کو عامل بالحدیث ٹھرانا ، واقعات کے سراسر خلاف ہے

اور یہ رباعیاں مؤمن کی نہیں ہو سکتیں اور بالفرض مان لیا جائے کہ اس کے مجموعہ کلام میں سے عبدالرحمن آہی نے نکال کر شائع کیں تو دیباچۂ مؤمن سے واضح ہے کہ مؤمن بہت سا کلام خارج کر چکا تھا یہ رباعیاں بھی اسی میں شمار کی جائیں گی۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مؤمن آزاد مشرب، وسیع القلب، رنگیں مزاج، یار باش تھا۔ مذہبی تقشف سے اسے سر و کار نہ تھا

مجلسی زندگی: مومن کے احباب اور شاگرد آزاد مشرب اور وسیع القلب تھے۔ اور حسن پرستی میں بھی نام پیدا کیا تھا۔ چند نام تمثیلاً پیش کئے جاتے ہیں :

(۱) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جن کی پاک دامنی کی بعض لوگ قسم کھانے کو تیار ہیں ان کی رندانہ زندگی کا ایک پہلو ملاحظہ ہو۔ رمجو طوائف جس کا تخلص نزاکت (گلشن بیخار ص۲۲۸ , ۲۲۹) ہے نارنول کی رہنے والی تھی، شیفتہ سے اس کے تعلقات ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے، چونکہ شیفتہ نے ان کی رسم مسی مالی کا قطعہ تاریخ لکھا ہے (۱۲۴۴ھ) اور گلشن بیخار کی تالیف ۱۲۵۰ھ تک یہ سلسلہ جاری رہا ۱۲۵۰ھ میں شیفتہ نے نزاکت کا ذکر نہایت والہانہ انداز میں کیا ہے۔ اس کے بعد شیفتہ کی طبیعت رندانہ مزاجی سے بیزار ہوئی اور وہ ۱۲۵۴ھ میں سفر حج کو روانہ ہوا۔ کریم‌الدین مولف تذکرۂ شعرائے اردو نے ۱۸۴۷ء - ۱۲۶۳ھ میں نزاکت کو بوڑھا پایا تھا۔ شیفتہ کی نسبت شراب خواری سے بھی کی گئی ہے چنانچہ شیفتہ

کے اس شعر سے اس کا ثبوت مہیا ہوتا ھے :

صہبا و مزا میر نہ کھینچ

(۲) وحشت ، غلام علیخاں کے متعلق شیفتہ لکھتے ھیں (گلشن بیخار ص ۲۳۴ و ۲۳۵) -

وهم به مقتضائے سن از رموز عشق ماهر و آشفتگی از سیمائش ظاهر. سالهاست که من و او نرد محبت باخته ایم. . . . از گرامی شاگردان مومن خاں است و ایں اشعار از کلام آں نکته‌داں :

آیتیں حرمت صہبا کی سناتا ہوں اُسے

ذکر سن سن کے رقیبوں کی مے آشامی کا

وحشت رموز عشق ھی سے واقف نہ تھا بلکہ شاید بادہ آشام بھی ہوں بقول حالی شیفتہ کے خاص دوست تھا ۔

(۳) تفضل حسین خاں مومن کے خاص دوستوں میں سے ھے اور شیفتہ اور تفضل حسین خاں جیسا مقام کسی دوست کو حاصل نہ تھا، مومن ان کو فارسی خط میں لکھتے ھیں :

''لالہ پھول چند آپ کا پہلو گرم کرے گا ۔ اور نوبہار غیرت وصال، غلام رسول خاں جو تمہاری خدمت گذاری کے طوق بندگی میں اپنے آپ کو مالک ارم جانتا ھے رسوائی اور تشہیر کا باعث ہوگا ۔''

(۴) عظمت، میر عظمت‌اللہ خاں مومن کے شاگرد ھیں ۔ مومن ان کے متعلق لکھتے (انشائے فارسی) ھیں :-

تیرا دل حسینوں کے وصال سے سیر نہ ہوا نہ ہوگا ۔ تو کس

خورشید لقا سے دور ہے اور کس آرام جاں سے مہجور
..... خدانخواستہ کیا تیرا محبوب دوسرے کے پہلو میں جا
بیٹھا ہے۔

(۵) آشفتہ ، حکیم سید منور علی دہلوی کی نسبت شیفتہ گلشن
بیخار (ص۳۱) میں تحریر فرماتے ہیں :
حکیم غلام حیدر خاں سے طب پڑھی، اور آشفتہ تخلص کے
اثر سے آشفتہ مزاج اور شوریدہ طبع سے کچھ نمک شور عشق
کا بھی اس کی گھٹّی میں پڑا ہے۔

ان چند ناموں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مومن کا حلقہ احباب رند مشرب تھے۔ اس عہد کے علماو فضلا بھی طوائفوں سے تعلقات رکھنا معیوب نہ جانتے تھے۔ غالب کی بادہ خواری کا چرچا یوں عام ہو گیا کہ غالب نے خود ڈھنڈھورا پیٹا۔

مومن کے فارسی دیوان میں ''بنائے میکدہ،، کا قطعہ ملتا ہے جس کا ایک شعر ہے :

خوش وقت رائے میکدۂ نو بنا نہاد
خوش وقت مے کشان بزندان شوق اسیر

امامن طوائف کے مرنے کی تاریخ کہہ کر طوائف پرستی کا ثبوت مہیا کرتے ہیں :

خزاں دیدہ شد نو گلے در جوانی
جوانی چنیں باغ امکاں ندارد

امامن که مانند او لعبتے خوش
پس پردہ، گردون گردان ندارد

چو امید وصلش به مردن فتادہ
خوشا درد مندے که درماں ندارد

چه گویم ز سال وفاتش چه گویم
غم و رنج و آزار پایاں ندارد
۱۲۶۰ھ

موسن کی آزادہ روی کا اس سے اندازہ کرسکتے ھیں که ایک دن بازار سے گذرتے ھیں ایک مکان پر نظر پڑی۔ چلمن کی آڑ میں ایک عورت کھڑی تھی۔ ان کی بیچین طبعیت نے کھوج نکالا اور وھاں آنے جانے لگے، یه عورت بڑی بذله سنج تھی۔ اسی کے مکان پر امته‌الفاطمه صاحب تخلص سے ملاقات ھوئی۔ یه مکان کسی بازاری عورت کا تھا، لیکن موسن یہاں روزانه آتے جاتے تھے اور شطرنج کھیلتے، اس سے آزادانه روش کا پته چلتا ھے وہ بچپن میں محبت کر کے رسوائی کا سارٹیفیکٹ حاصل کرچکے تھے، جوانی میں کون مانع ھوتا، حکیم غلام نبی کا انتقال ۱۲۳۱ھ میں ھوتا ھے اور صاحب سے محبت ۱۲۳۶ھ میں ھوئی اور دو تین مراحل محبت اس سے بھی پیشتر طے کرچکے تھے۔

مؤمن کے یہاں شعرا کا مجمع بھی ھوتا، اور شطرنج کی محفل بھی جمتی، راگ رنگ کا جلسه بھی برپا رھتا، اور سیر کواکب بھی ھوتی تعویذ نویسی کا شغل بھی ساتھ ھی ساتھ چلتا۔ اور نسخه نویسی تو وراثتاً ملی ھی تھی، شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کے نام رکھنے کا اس قدر اثر ضرور رھا که طبیعت کبھی کبھی مذھب کی طرف بھی مائل ھوجاتی اور

مثنوی جہادیہ جیسی اصناف سخن بھی ظہور پذیر ہوتیں۔ مؤمن نے ایک فارسی خط میں حکیم احسن‌اللہ خاں کو صبح سے رات تک کی روئیداد لکھی ہے جس سے ان کے مشاغل کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے (انشائے فارسی مخطوطہ رضا لائبریری رامپور)۔

''کوئی صبح ایسی نہیں ہوتی کہ میرے نالے سوتے ہووں کو بستر خواب سے بیدار نہ کریں، اور کوئی شام اس طرح نہیں آتی کہ میری آہ فلک سوز، طائر سدرہ کے بال و پر کو جلا کر زمیں پر نہ گرائے، برادر مہربان میں اپنے اوقات شبانہ روز کا کچھ حصہ قلم بند کرتا ہوں جس سے مصائب کا اندازہ ہوسکے گا۔ ہر صبح، جب مرغ بانگ دیتا ہے، اور حی‌علی‌الفلاح کی صدا فضا میں بلند ہوتی ہے، انتہائی افتادگی اور ناتوانی کے باوجود بستر سے اٹھتا ہوں، موذن کی اذاں کے جواب میں لاحول‌ولاقوۃ کہتا ہوں اور وضو کے بہانے آسایش سے ہاتھ دھوتا ہوں، نماز ادا کرنا، شیاطین کے شر سے امان چاہنا ہے، اور مناجات کا شور محض اس لئے ہے کہ شیطان سیرت لوگوں سے محفوظ رہوں ورنہ ''صنم،، خانۂ دل میں اور منہ قبلہ کی طرف کب جائز ہے۔ بت آستیں میں اور مصلّٰی کاندھے پر، کس طرح روا ہو سکتا ......ہے ابھی دعا لب پر ہوتی ہے اور تسبیح ہاتھ میں کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی صدا بلند ہوتی ہے اس صدا سے خوشی کا دروازہ دل پر بند ہوجاتا ہے اور حضوری خدا کا شور لبیک ختم ہو جاتا ہے گھر سے خوش آمدید کہتا ہوا باہر نکلتا ہوں اور خوشی کے دروازے اپنی ذات پر بند کر لیتا ہوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شاگرد ماتھے پر بل ڈالے اور شکایات

کا دفتر زبان پر، کھڑے ھیں ابھی ان حضرات سے معذرت شروع کی ھے، کہ دوسرے بلائے ناگہانی کی طرح نازل ھو کر چند اور ساتھیوں کے آنے کی خبر سناتے ھیں چار و ناچار، مرحبا، مرحبا، اور حوش آمدید خوش آمدید مروتاً کہتا ھوا استقبال کرتا ھوں۔ اتنے میں دوسرے بھی آ جاتے ھیں اور گفتگو کے شور سے ہنگامۂ محشر بپا ھو جاتا ھے، اس وقت دل کی یہ کیفیت ھوتی ھے :

از علم بتنگم، از دلم بیروں باد
محزوں شدم از ہنر، ہنر محزوں باد

از کاوش دانشم، دلم پر خون است
یارب کہ درون دانشم پُر خوں باد

بحث و تکرار کی گرمی کا مقصد ادب آموزی ھے یا دل سوختہ استاد کی جگر سوزی کا سامان سہیا کرنا اس کے باوجود ان باتوں کو برداشت کرنا پڑتا ھے، ستم بالائے ستم یہ ھے کہ جس کسی کو کوئی الجھن پیدا ھوئی اور وہ اپنا دکھڑا لے بیٹھا، مجھپر اس کی ھمدردی اور ھم نوائی کرنا فرض، اس سے زندگی اور تلخ تر ھو جاتی ھے۔ یہاں اپنے مصائب کیا کم ھیں کہ دوسروں کی دل سوزی سے زندگی اور بھی دوبھر ھو جاتی ھے اپنا یہ حال ھے :

عقلم سرگشتہ ہر زمانے دارد
ہر نجم بہ طالعم زیانے دارد

پروا ز غمم نیست بسے را بہ جہاں
دیوانہ دلم، غم جہانے دارد

مومن اس اعتقاد کے باوجود، کہ کوئی ذرہ خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا، ستارہ پرست ہے اور اس قدر بے تعلقی کے ہوتے ہوئے صبح سے شام تک اسطرلاب بدست ہے، ہر ایک کے سوالات کا جواب دیتا جاتا ہوں، جب سورج ڈوب جاتا ہے تو اس رصد بندوں کی مجلس سے اٹھتا ہوں اور ندامت کے آنسو تمام دن کی کارگذاریوں پر بہاتا ہوں، اب حسینوں کی ملاقات کا وقت ہوتا ہے اور ان کی جدائی کا صدمۂ جاں گسل :

سیارہ شناسم و ندانم
تا طالع و کوکبم چه باشد

یہ ہیں میرے رات دن کے مشاغل، ایک تازہ قصیدہ کہا ہے اگر محمود نقل کر لے تو ملاحظہ سے گذر سکے گا۔''

کے روز کے حاضر باشوں میں سے حکیم سکھانند رقم تخلص بھی تھے، ‌اعری میں شاہ نصیر سے تلمذ رکھتے تھے۔ اور علم رمل میں مومن ‌ناگرد تھے۔ بڑے خوش پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق، ‌الطبع، حلیم، خوب صورت اور شکیل آدمی تھے، دھرم پورہ میں تھے، کوئی چالیس سال کی عمر تھی، استاد کا ایسا ادب کرتے تھے، کوئی بیٹا باپ کا ادب کرتا ہے (بہادر شاہ ظفر ص ۴۱۰ - از احمد جعفری) اس سے مومن کی مجلسی زندگی کا اندازہ کیا جا ہے وہ شگفتہ مزاج، خندہ جبیں، ظریف، بذلہ سنج تھے اور حلقۂ ‌وسیع تھا۔

سیاسیات۔ مومن نے جب ہوش سنبھالا تو انگریزوں کی حکومت میں پائی۔ شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی نام کے بادشاہ تھے۔

عوام اور خواص کمپنی کے وفادار تھے۔ لیکن گھر پر تعلیم پانا اس حقیقت کو ظاهر کرتا ھے کہ خواص دلی کالج کی تعلیم کو پسند نہیں کرتے تھے، مومن کی خاندانی جاگیر کے مواضعات موضع بلاھه وغیرہ پرگنہ نارنول میں تھے، جب انگریزوں نے نواب فیض طلب خان کو جھجر کی ریاست دی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا۔ اس طرح ان کی خاندانی جاگیر ضبط ہو گئی، نواب نے بطور معاوضہ ہزار روپیہ سالانہ پنشن مومن کے اسلاف کے نام پر بحال رکھی، مومن کے زمانے تک یہ وظیفہ وراثتاً ریاست جھجر سے ملتا تھا۔ دھلی میں انگریزی اقتدار کو خواص اور عوام پسند نہیں کرتے تھے، شاہ عبدالعزیز محدث رح انگریزی ملازمت کو حرام قرار دے چکے تھے اور اس عہد کے مشاھیر علماء کا فتوی تھا کہ ملک دارالحرب بن گیا ھے اسی لیے سید احمد شہید نے اسلامی حکومت کے قیام کے لیے بیعت جہاد کی لینی شروع کی اور مصلحتاً پہلے سکھوں کے خلاف جہاد جاری کیا ، نتیجۃً مسلم رائے عامہ غیر اسلامی حکومت کے خلاف منظم ہو گئی، دھلی کا قیام اکابرین ناجائز سمجھتے تھے ۔ (رقعہ مرزا مظہر متعلق قیام روھیل کھنڈ) اسی وجہ سے مومن کے دل میں شروع ھی سے انگریزوں کے خلاف جذبۂ منافرت پیدا ہوا، اور وہ مرتے دم تک نہ گیا، چنانچہ ایک خط میں اپنے چچا حکیم غلام حسین خان کو لکھتے ھیں کہ ناقدرداں کافروں کے ھاتھوں میں حکومت ھے اور شریف اور نجیب لوگوں کی قدر کیا ھے، اور دولت اور اقبال عنقا لکھنؤ کا سفر پیش نظر ھے، وھاں اگر مطلب حاصل نہ ہوا تو حیدر آباد (دکن) کا ارادہ ھے چونکہ راجہ چندو لال کی قدر دانی شعرا کے بارے میں بہت شہرت رکھتی ھے (انشائے فارسی مخطوطہ) ۔

وفات ۔ مومن کی صحت اچھی تھی ۔ اور ان کو جوان تصور کرنا غلط نہ تھا ۔ باون سال کی عمر ہو چکی تھی کہ ایک دن مکان مسکونہ کی مرمت کرا رہے تھے ۔ یہ واقعہ غالباً مارچ ۱۸۵۲ء (جمادی لاول ۱۲۶۸ھ) کا ہے چھت کا عملہ اتار دیا گیا تھا، مومن بھی کام کی نگرانی میں مصروف تھے مزدور بلّیاں نیچے سے اوپر کو دے رہے تھے کہ مومن کا دھیان بٹا اور منڈیر سے نیچے گرے (عرش حیات مومن ص ۸۱ گلستان سخن ص ۴۴۴) ھاتھ اور بازو ٹوٹ گیا ۔ رشتہ دار جمع ہو گئے، اٹھایا علاج معالجہ شروع ہوا، خود اسی حادثہ کی تاریخ کہی :

مومن فتاد از بام، گفتم چه رفت گفتا
خود با خروش، بشکست دست و بازو
گفتم که با مدت گفت، تاریخ ایں مصیبت
گفتا خموش گفتم بشکست دست و بازو
۱۲۶۸ھ

صاحب گلستان سخن کا بیان ہے :

انواع شدید نے وہ رنج دیا کہ ان کا تحمّل حد بشر سے خارج تھا ۔ آخرالامر اسی سال کہ بارہ سو اٹھسٹ ھجری تھے، سفر آخرت اختیار کر کے وابستگان جگر فگار کے دل کو رنج اور داغ میں مبتلا اور حوران فردوس کو سعادت اقبال سے مستعد کیا، اس امر ناگزیر کے کئی مہینے کے بعد نواب مصطفی خان بہادر شیفتہ تخلص کہ انسان صورت اور ملک سیرت ھیں، رویائے صادقہ میں دیکھتے ھیں کہ گویا مومن خان کا خط آیا ہے، اور اس کے خاتمہ پر خط سبز سے مرقوم ہے مومن اھل الجنہ" . . . .

مرزا اسداللہ خان غالب نے اس رباعی کی عبارت میں اظہار الم اور اس نظم کے پیرائے میں افشائے غم کیا :

شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر
خوں نابہ برخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش باشم ہمہ عمر

ایام مرض میں بقول عبدالرحمن آهی اور حکیم احسن اللہ خان مومن کی قوت برداشت قابل ستائش رہی، فارسی دیوان کی تکمیل کے سلسلے میں بعض غزلیں کہہ کر داخل دیوان کیں، دیوان مومن اردو کی تصحیح آهی کی فرمائش سے کی، اور تین روز قبل فارغ ہوئے عارف کی وفات (جمادی‌الثانی ۱۲۶۸ھ) کے بعد اور تسکین کی وفات (۱۷ شوال ۱۲۶۸ھ) سے پہلے ان کا انتقال غالباً رمضان المبارک ۱۲۶۸ء (جون ۱۸۵۲ء) میں جمعہ کے روز ہوا، نماز جنازہ جامع مسجد میں ہوئی، دلی دروازہ کے باہر میدھپورہ میں زیر دیوار احاطہ مقبرہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب جانب شرق دفن ہوے اور دلی کی بزم سخن سونی ہو گئی، آهی نے ”ماتم مؤمن خاں“ سے (۱۲۶۸ھ) تاریخ نکلی -

تصانیف - کلیات اردو - ۱۲۴۳ھ میں شیفتہ نے مومن کے کلام کو فراہم کیا، اور مومن نے حذف و اضافہ کے بعد مکمل کیا اس نسخہ کو ۱۸۴۶ء میں مولوی کریم‌الدین پانی پتی نے مطبع رفاہ عام دھلی میں چھپوا کر پہلی بار پیش کیا -

(قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ اس سے پہلے دیوان مومن طبع ہوا تھا - تذکرۂ شوق ص ۲۰۷) یہی دیوان منشی دیبی سہائے نے

انڈین پنچ پریس میں چھاپا (۱۸۵۵ء) اسی نسخه کو منشی کنہیا لعل نے مجلس پریس دهلی میں بعد وفات مومن (۱۸۵۲ء) چھاپا (مملوکه میونسپل لائبریری گوجرانوالا) ۔

عبدالرحمن آهی کے پاس جو نقول تھیں ان کو ترتیب دیا اور مومن سے ایام بیماری میں تصحیح کرائی، اور یه دیوان منشی نول کشور نے اپنے مطبع لکھنؤ میں ۱۸۷۴ء میں چھاپا ۔ مروجه نسخه کلیات مومن کا یہی ہے ۔

دیوان فارسی ۔ حکیم احسن الله خان کی فرمائش سے آهی نے ترتیب دیا ۔ اور مطبع سلطانی قلعهٔ معلی دهلی میں ۱۲۷۱ھ میں چھپا ۔

انشائے فارسی ۔ حکیم احسن الله خان نے مومن کے تمام فارسی رقعات اور تقریظیں وغیرہ جمع کر کے مطبع سلطانی قلعه معلی دهلی میں چھپوائیں ۔ اس کے علاوہ بقول عرش گیاوی (حیات مومن ص۶۴، ۶۵) :

> جان عروض، قلمی رساله قوافی اور عروض میں تھا ۔ شرح سدیدی و نفیسی (طب میں) رساله خواص پان قلمی موجود تھے جو دستیاب نه ہوئے اور کچھ خطوط اور ڈیڑھ سو غزلیں کتاب خانه الو میں موجود تھیں جو حاصل نه ہو سکیں ۔

بیویاں اور اولاد۔ مومن کے سوانح نگار اس امر پر متفق ھیں که اس کی ایک ھی شادی خواجه محمد نصیر کی دختر سے ہوئی، اس سلسلے میں انہوں نے مومن کی روایات کو بھی نظر انداز کر دیا ۔ انشائے فارسی میں شیخ غلام ضامن کرم (شاگرد مومن) کے نام ایک خط موجود ھے جس میں مومن کی پہلی شادی کا تفصیلی بیان ھے، اس کے بعد خواجه محمد نصیر کی دختر سے شادی ہوئی ھے، بیان مومن قابل غور ھے (انشائے فارسی) :

رقعه بنام همیں بزرگ (کرم) در جواب انداز نامه، به خبر خانه رسیدن و از شکایت زن و پدرش گردیدن اگر انصاف باشد ازیں نسبت که من دخترش را بعقد آوردہام تا روز جزا جز فخر و مباهات سخنے بر زبان نیارد . . . . . هیهات هیهات که باین علو شان با مشتے خاشاک منے ساختم . . . . .

وه دو تین ماه خسرال میں ره چکے هیں (خسر عظیم‌الله بیگ کمیدان ساکن سردهنه) خط میں سردهنه کی مذمت کی هے اور قیام کا حواله دیا هے، عظیم‌الله بیگ نے کرم سے مومن کی والده کی نسبت کچھ شکایت کی هے، مومن ناراض هو کر لکھتے هیں :

طعن نسبت به جناب والده مکرمه معظمه نمودن، زبان به مذمت مریم علیها السلام کشودن است، عظیم الله بیگ که پایهٔ افتخارش جز به منصب کمیدانی هیچ نیست . . . دو سه ماه که به نادانی و ساده دلی مرتکب جریمه به نا اهلاں ساختن گردیدم، از هیچ کس جز ملامت و نفرین نه شنیدم، اکنوں که فارغ البال و خوش حالم، خدا نه کرده به مصیبت خود را گرفتار نمایم و به مجلس از عقل هزار فرسخ دور افتادهگاں درآیم مصرع :

من جرب المجرب حلت به الندامه

آیهٔ مثنیٰ و ثلٰث و ربٰع - خوانده ام و معنی آں از اساتذه به تحقیق رسانده، اگر از حرام توبه کرده ام، حلال نه گذاشته ام، و اگر پائے از هرزه گردی برداشتهام و چوں از جهلائے نابکار رنجها کشیدهام، و به پیوستن دهاقین بد اطوار مصیبت ها دیدهام، سر آں دارم که با همچو عالی خاندانے، فلک شکوهے وصلت

نمایم، و چشم تماشا طلب، به دیدار خوش نسبے زهره گوهرے کشایم، ورنه از دو سه جا پیغام تنا کح بر زبان . . . . .

آگے چل کر مومن لکھتے ھیں که عظیم‌الله بیگ (خسر مومن) سعد قلی خان بہادر کے متوسلین سے تھا ، اور سعد قلی خان ھمارے خاندان کے غلاموں میں سے تھیں -

غالباً مومن کی یه شادی حکیم غلام نبی خان کے انتقال (۱۲۳۱ھ) کے بعد ھوئی اور شیخ غلام ضامن کرم کی کوشش سے ھوئی تھی - اور اسی وجه سے انھوں نے مصالحت کی کوشش کی، مومن کی بیوی دیہاتی تھی - کہاں دھلی کی اعلی مجلس اور کہاں یه غریب دیہاتن، پھر ساس کی سرزنش آخر دھلی کے قید خانه سے یه بھولی بھالی بھاگ نکلی، ماں باپ سے جا کر شکایت کی، انھوں نے درمیانی شیخ غلام ضامن کرم کو بیچ میں ڈالا، اور مومن کو ایک ناصحانه خط لکھوایا، جس میں مومن کی والده کے رویه کی شکایت تھی اور مطالبه کیا که مومن اپنی بیوی کو آ کر لے جائے، اس کے جواب میں مومن نے جو اپنی متلون طبیعت سے مجبور تھے - سردھنه جانے سے انکار کر دیا، اور عظیم‌الله بیگ کے سرپرست سعد قلی خان کو اپنے خاندان کا غلام بتایا - اور یه بھی طعنه دیا که میں نے حرام سے توبه کی ھے نه که حلال سے - اور دو تین اور چار بیویاں رکھنے کا استدلال قرآن عظیم سے پیش کیا، پھر یه بھی ظاھر کیا که دو تین خاندانوں میں سے پیغام آ رھے ھیں - اب کسی اونچے خاندان میں شادی کا اراده ھے وغیره وغیره - پہلی شادی ناکام رھی، کوئی اولاد اس بیوی سے ھوئی یا نہیں، یه امر پایۂ تحقیق کو نه پہنچ سکا، مومن کے خطوط میں جو احمد نصیر خان (پسر مومن) کو لکھے

گئے ھیں احمد نصیر خان کی بڑی بہن کی جانب سے دعا لکھی گ
ھے مثلاً

(۱) خواھران شما پس از بندگی و دعا لبے بہ پرسہ
می کشایند . . . . .

(۲) گرامی خواھر شما را می برم . . . . .

(۳) خواھران شما تا ازیں مژدہ آ گاھی یافتہ اند دیگر خود
در خود نیافتہ

ایک خط بنام دختر ھے :

لخت جگر سلمہا ۔ عریضۂ ایشاں حرز جاں کردم . . . . از
تنہائی بجانم، کہ از دخترانم خود اکثر ایام مہجورم، دل
صحبت شما تسلی می شد ۔

غالباً یہ مومن کی پہلی لڑکی ھوگی (ورنہ مومن کی بھانجی ھوگی
عبدالرحمن آھی کو منسوب ھوگی اور آھی منبائے مومن مشہور ھو
یہ مسلمہ ھے کہ احمد نصیر خان، خواجہ محمد نصیر رنج کی دختر
پہلی بڑی اولاد ھے ۔

دوسری شادی ۱۲۴۵ھ ۔ پہلی شادی کی ناکامی کے بعد خوا
محمد نصیر رنج نبیرۂ خواجہ میر درد کی دختر نیک اختر انجمن ال
بیگم (انجم النسا بیگم) سے دوسری شادی ھوئی ۔ اس کا قطعہ تاریخ ۔

حیف صد حیف کہ در فصل بہاراں بلبل
ناگہاں گشت گرفتار، بہ دام صیاد

آہ صد آہ کہ آزادگیٔ نکہت گل

با همه رنگ تجرد همگی شد برباد

یعنی آں مومن آوارہ کہ در آزادی

بہ جہاں ضرب مثل بود چو سرو آزاد

ایں زماں پائے بہ زنجیر تعلق گشتہ

یوسفے بود سروکار بہ زنداں افتاد

چہ خوش ایں واقعہ را گفت، اسیرے تاریخ

مرغ بے بال و پر، اندر قفس آمد، فریاد

۱۲۳۵ھ

اولاد زوجۂ ثانی - دوسری بیوی سے پہلی اولاد احمد نصیر خان ہیں - احمد نصیر خان کی ولادت ۱۲۴۷ھ میں ہوئی، قطعہ ولادت اصغر علی خان اصغر رامپوری شاگرد مومن نے لکھا ہے جس کا آخری شعر ہے :

روئے الہام سے کہا کہ بڑھا

ابن شاعر پہ لفظ لاثانی

(۱۲۴۷ھ)

احمد نصیر خان کے بعد ایک اور لڑکا ہوا جس کی تاریخ مومن نے کہی ہے :

پسرم دادہ اند، سال وجود

نو گل باغ جاہ و اقبال است

۱۲۵۸ھ

تیسری اولاد محمدی بیگم (اهلیه مولوی عبدالغنی وکیل سیتاپو متوفیه ۱۲۹۲ھ) هیں ان کی تاریخ ولادت مومن نے بڑی لطیف کہی ہے :

نال کٹنے کے ساتھ ھاتف نے
کہی تاریخ دختر مومن
(۱۲۵۹ھ)

آغاز ۱۲۶۱ھ میں ایک اور لڑکا پیدا ھوا، اس کے مرنے کی تاریخ ۱۲۶۳ھ ہے جس سے معلوم ھوتا ہے کہ دو سال جی کر داغ جدائی دے گیا :

جگر گوشه ما به کنج لحد
اماں از جهان پر آفات یافت
دو سال اندر آغوش مام و پدر
ستم دید و پاس مکافات یافت
چه ماتم که پیر خرد سال فوت
ز هیهات، هیهات هیهات یافت
(۱۲۶۳ھ)

فاطمه سلطان بیگم مومن کی بڑی پیاری اولاد تھی، جس کے مرنے پر رقت خیز قطعهٔ وفات لکھا ہے، اگر یه پہلی کی لڑکی نہیں تو پھر انجمن النساء بیگم سے یه پانچویں اولاد تھی - اس کا سنه ولادت متعین نه ھو سکا، ۱۲۶۵ھ میں وفات ھوئی :

رفت لخت جگرم زیر زمیں
چرخ بر خاک نشاندم امروز
در غم فاطمه سلطان بیگم
جستِ فاطمه خواندم امروز

تا بجانش نه رواں شد دی شب
جاں بہ تاریخ فشاندم امروز

مؤمن کی نسل احمد نصیر خان سے چلی، اور محمدی بیگم سے بھی، ۱۲۶۸ھ میں، جس وقت مؤمن کا انتقال ہوا، تو احمد نصیر خان کی عمر اکیس (۲۱) سال تھی، تذکروں میں جو کم عمری کا حوالہ ملتا ہے، وہ غلط ہے، ملاحظہ ہو حیات مؤمن ص ۸۷ :

> مؤمن کا جب انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے، احمد نصیر خان چھ سات سال کے تھے بعد مؤمن ان کی تعلیم نانہالی رشتہ داروں کے طفیل ہوئی ۔

یہ بیان سراسر غلط ہے، احمد نصیر خان کی تعلیم و تربیت میر تفضل حسین خاں صاحب نے کی جو مؤمن کے مخلص دوست تھے ، جس کا اعتراف مؤمن کے خطوط میں ہے، رقعہ بنامِ تفضل حسین خان بہنگام مرض‌الموت (انشائے فارسی) :

> آرے در معاملۂ احمد نصیر و جناب مرا چہ جاے دم زدن است ..... خان والا شان چہ انصاف است کہ اولاد مؤمن از خوان احسان شما بقدر نصیب خویش بہرہ یابند و من محروم باشم .....

احمد نصیر خان سے دو لڑکے اور ایک لڑکی یادگار رہی، بڑے لڑکے کا نام عبدالوہاب، اور چھوٹے کا نام محمد نصیر، لڑکی کا نام عزیز بیگم ہے، ۱۹۲۹ء میں عزیز بیگم اور محمد نصیر بقید حیات تھے (حیات مؤمن ۔ از عرش) ۔

محمدی بیگم کے لڑکے سید ناصر حبیب ناصر وکیل ریاست دتیا نبیسۂ مؤمن ہیں جنہوں نے حیات مؤمن کا قطعہ تاریخ کہا ہے -

دل نے برجستہ کہا کہ یہ مصرع تاریخ طبع
عرش والا جاہ نے حالات مؤمن کے لکھے
۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء)

احباب - مؤمن کے فارسی خطوط سے اس کے بعض مخلص احباب اور شاگردوں کا پتہ چلتا ہے -

(۱) تفضل حسین خان جو کمپنی کی ملازمت میں معزز عہدے پر فائز تھے، مؤمن کے مخلص دوست تھے، اور احمد نصیر خان کو مؤمن سے مانگ لیا تھا بیٹے کی طرح پرورش کرتے تھے - مؤمن کے خطوط میں ان کا ذکر عزت اور احترام کے ساتھ آتا ہے -

(۲) منشی امیر علی سندبلوی صدر امین اجمیر بھی مؤمن کے دوست تھے -

(۳) منشی کرم احمد بھی کمپنی کی ملازمت میں نمایاں عہدے پر ممتاز تھے - ان کے نام بھی خط انشائے فارسی میں ہے -

(۴) حکیم احسن اللہ خان مؤمن کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور مؤمن کے مداح، فارسی دیوان اور انشائے فارسی انہوں نے مرتب کرائیں اور مطبع سلطانی قلعۂ دھلی میں ۱۲۷۱ھ میں چھپوائیں - مؤمن کی شہرت کا باعث بنے - بہادر شاہ ظفر کی وزارت سے بھی سرفراز تھے ۱۸۷۳ء میں انتقال ہوا -

شاگردان مؤمن - بعض احباب مؤمن کے شاگرد بھی تھے، اس لیے ان کا ذکر شاگردوں کی فہرست میں کیا جاتا ہے، تذکروں سے مؤمن کے حسب ذیل شاگرد ٹھیرتے ہیں:

(۱) **آشفتہ** حکیم سید منور علی دھلوی مولد، الور مسکن، فن طب میں حکیم غلام حیدر خان اور شاعری میں مؤمن سے تلمذ تھا ۱۸۴۶ء میں چالیس سال عمر تھی -

(۲) **آھی** - میر عبدالرحمان خلف میر حسین تسکین دھلوی، مؤمن کی حقیقی بھانجی آھی کو منسوب تھی، مؤمن نے فرزند کی طرح پالا، آھی نے کلیات مؤمن مرتب کیا ھے، فارسی میں صہبائی سے تلمذ تھا، فن معما میں کمال تھا - شعر فہمی کی شہرت تھی ۱۸۷۵ء کے قریب انتقال کیا -

(۳) **اصغر** - اصغر علی خان خلف نواب عبداللہ خان رام پوری مومن کے شاگرد تھے، بعض فنون میں بہادر شاہ ظفر کی بھی شاگردی تھی، اڑتیس سال کی عمر میں ۱۲۶۶ھ رحلت کی، دیوان اردو مطبوعہ موجود ھے، تمام تذکرہ نویسوں نے اصغرعلیخان نسیم دھلوی کا اصغر تخلص رکھنا بیان کر کے دھوکا کھایا ھے، اصغر اور ان کے والد عبداللہ خان کے متعلق مؤمن کے فارسی دیوان میں قطعات تاریخی موجود ھیں اصغر مرحوم نے مؤمن کے فرزند احمد نصیر خان کی ولادت پر قطعہ تاریخ کہا ھے جو ان کے دیوان میں موجود ھے -

(۴) اکبر ۔ محمد اکبر خاں ۔ نواب مصطفی خان شیفتہ کے چھوٹے بھائی تھے ۔ '' مثنوی حنین مغموم '' میں مؤمن نے اکبر کو اپنا شاگرد ظاہر کیا ہے ان کا انتقال راولپنڈی میں ۱۸۷۵ء کے قریب ہوا ۔

(۵) برق، قاضی نجم الدین سکندر آبادی ۔ پہلے تسکین اور پھر مؤمن سے اصلاح حاصل کی، طرز مؤمن میں شہرت حاصل کی ۔

(۶) بیتاب، عباس علی خان رامپوری ۔ مؤمن کے خاص شاگردوں میں تھے. آخر میں غالب سے بھی دیوان پر نظر ثانی کرائی تھی، ۶ جون ۱۸۸۳ء کو انتقال ہوا، مدتوں دہلی میں رہے تھے، مؤمن نے ان کی شادی پر قطعہ تاریخ کیا تھا، جو اردو کلیات میں موجود ہے، دیوان مطبوعہ ہے، اردو نثر کی داستانیں غیرمطبوعہ بھی یادگار ہیں ۔

(۷) بیمار ۔ علی بخش رامپوری ابتداً میں غالباً مصحفی سے اصلاح لی، پھر غفلت رامپوری کے شاگرد ہوے، نیاز فتحپوری بحوالہ نظام رامپوری مؤمن کی شاگردی بھی لکھتے ہیں (مؤمن نگار نمبر ۱۹۲۸ء) رنگ کلام سے انداز مؤمن پایا جاتا ہے، اجزاے دیوان قلمی موجود ہیں، ۱۲۷۱ھ میں وفات پائی ۔

(۸) تسکین ، میر حسین دہلوی شروع میں شاہ نصیر سے اصلاح لی، پھر مؤمن کے شاگرد ہو گئے، ان سے مؤمن کی اپنایت

تھی آھی ان کے فرزند مؤمن کے متبنٰی تھے، تسکین کا رتبہ شاعری شاگردان مؤمن میں بہت بلند ھے، مختصر دیوان مخطوطہ رضا لائبریری رام‌پور میں موجود ھے، پچاس برس کی عمر میں ۱۷ شوال ۱۲۶۸ھ کو رام پور میں انتقال ھوا۔

(۹) تہور ۔ مرزا غلام فخرالدین ۔ مؤلف گلستان سخن کے برادر حقیقی تھے، پہلے عبدالرحمان احسان سے اصلاح لی، پھر مؤمن سے مشورہ کیا ۔

(۱۰) ثروت محمد بخش بریلوی، مؤمن کے شاگرد تھے ۔

(۱۱) خورشید ۔ خورشید احمد مجددی رامپوری ۱۲۳۰ھ میں لکھنئو میں پیدا ھوے، سیاح تھے۔ مؤمن کے بعد غالب سے بھی اصلاح حاصل کی تھی ۔

(۱۲) راسخ ۔ سعادت علیخان دھلوی شاگرد مؤمن معمولی کلام تھا ۔

(۱۳) راحت ۔ مرزا محمود بیگ دھلوی ۔ وطن روم، مسکن دھلی، مؤمن کے شاگرد تھے ۔

(۱۴) سالک ۔ مرزا قربان علی بیگ، مولد حیدرآباد، مسکن دھلی تھا، ابتداً میں مؤمن سے اصلاح لی، بعدہ غالب سے استفادہ کیا ۔

(۱۵) **سروش** ۔ عبدالوھاب خان خلف عبدالرحمان خان رام پوری ۔ ابتداً میں مؤمن اور پھر غالب سے فیض اٹھایا ۔

(۱٦) **سکندر** - سکندر خان، باشندہ شاہ جہان پور، مؤمن سے کسب سخن کرتے تھے - ایک دن ایک شعر کی اصلاح پر مؤمن سے مباحثہ ہوا اور ترک مشورہ کیا -

(۱۷) **شورش** - غلام احمد دہلوی، شیفتہ کے شناساؤں میں سے تھا، فکر معاش میں مبتلا رہا، کچھ دنوں کتابت کی، ۱۸۴۷ء میں الور میں پندرہ روپیہ مشاہرہ پر ملازم تھے -

(۱۸) **شیدآ** - میر جھبو خان دہلوی - شاگرد مؤمن بقول نساخ (سخن شعرأ) انتقال کو گیارہ برس ہوے غالباً ۱۲۷۰ھ میں انتقال ہوا -

(۱۹) **شیفتہ**، نواب مصطفٰی خاں دہلوی خلف عظیم‌الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضٰی خاں بہادر مظفر جنگ ولادت ۱۲۱۸ھ میں ہوئی، ذہانت خداداد تھی، سولہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی اور جلد ہی کمال پیدا کر لیا شروع میں آزادانہ روش رہی - ۱۲۵۴ھ میں حج کو روانہ ہوے اور ۱۲۵٦ھ میں واپس آئے - دینی رجحان بڑھ گیا - ادبی مجلس کے صدر رہے - اردو، فارسی میں مؤمن سے اصلاح لیتے تھے مؤمن کے انتقال کے بعد غالب سے بھی اصلاح حاصل کی - درجہ استادی پر فائز تھے - حالی نے ان ھی سے ذوق تنقید حاصل کیا - غدر، جنگ آزادی کے محرکین میں شیفتہ بھی مجرم قرار دیئے گئے، لیکن نواب صدیق حسن خاں کی سفارش سے بری ہوے

تذکرہ گلشن بیخار، سفرنامہ(رہ آورد) اور اردو، فارسی کلیات یادگار ھیں ۱۲۸۶ھ میں وفات پائی۔

(۲۰) **صاحب** امتہ الفاطمہ۔ لکھنؤ کی ساکنہ، دھلی چند ماہ بطور سیاحت آئی۔ مؤمن سے آتے ھی ربط دلی پیدا ھوگیا مؤمن کے فیض محبت سے شاعری کا بھی چسکا ھوگیا تھا، مؤمن سے اصلاح لی۔

(۲۱) **صبر،** اجودھیا پرشاد، مقیم دھلی، نشاط، شاہ نصیر اور مؤمن سے اصلاح لیتے تھے۔

(۲۲) **صفیر**۔ میاں جان دھلوی شاگرد مؤمن۔

(۲۳) **ظہور**۔ ظہور علی ھریانوی مقیم دھلی، شاگرد شاہ احسان و شاہ نصیر، و مؤمن۔

(۲۴) **عظمت**۔ میر عظمت اللہ بریلوی۔ مقیم دھلی مؤمن کے کے شاگرد بھی تھے، اور مخلص دوست۔ کمپنی کی ملازمت میں منسلک تھے۔ شیفتہ سے خصوصی تعلقات تھے۔

(۲۵) **عنایت**۔ عنایت علی خاں رامپوری، فارسی میں صہبائی سے اور اردو میں تسکین اور مؤمن سے اصلاح لی (۳۰) برس کی عمر رمضان ۱۲۶۴ھ میں وفات پائی۔

(۲۶) **غربت**۔ ھدایت علی خاں رام‌پوری مؤمن کے شاگرد تھے۔ پھر شیخ مہدی علی ذکی مرادآبادی سے مشورہ کیا ۱۲۹۰ھ میں ۶۳ برس کی عمر تھی۔

(۲۷) غریب ، غریب‌اللہ ۔ باشندۂ شاہ‌آباد، شاگرد مؤمن، انگریزی فوج میں مشی تھے۔

(۲۸) خلق، حکیم مولابخش میرٹھی، طرز مؤمن میں شہرت پائی، ۱۲۹۷ھ میں وفات پائی، دیوان مولانا حالی کی تقریظ کے ساتھ طبع ہو چکا ہے۔

(۲۹) قیصر ۔ مرزا خدا بخش شاہ عالم بادشاہ کے نواسہ اور مؤمن کے شاگرد تھے ۔

(۳۰) کاظم ۔ کاظم علی بجنوری، شاگرد نصیر و مومن ۔

(۳۱) کرم ۔ شیخ غلام ضامن کوتانوی، مدتوں دھلی میں رہے، زیادہ وقت ریاست حیدرآباد میں گذارا اور آخر ۱۲٦۵ھ میں وفات پائی مؤمن کے خصوصی دوستوں میں تھے ۔ بہت ھنس مکھ تھے ۔

(۳۲) موجد ۔ حشمت علی خاں رام پوری، معززین میں سے تھے ۔ مومن کے شاگرد، بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں میں انتقال ھوا ۔ صاحب دیوان مطبوعہ ۔

(۳۳) مضطر ۔ مرزا سنگین دھلوی بقول صاحب سخن الشعراً مؤمن کے شاگرد تھے ۔

(۳۴) مسکین ۔ سید عبدالواحد خیرآبادی ، ۱۲۷۱ھ میں بھوپال میں انتقال ھوا ، مؤمن کے شاگرد، دیوان مسکیں اور چشمہ شیریں یادگار ہے۔

(۳۵) ناظم ۔ نواب یوسف علیخاں والی ریاست رام‌پور، ابتداً میں
مومن سے اصلاح لی ۔ اور پھر غالب سے، عرشی صاحب
ناظم رضا لائبریری رامپور کی رائے میں یوسف علیخاں کی تحریر
سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غالب سے پہلی بار فروری
۱۸۵۷ء میں اصلاح لی، لیکن امیر مینائی انتخاب
یادگار (ص۔ ۷) میں لکھتے ہیں: پہلے مومن خاں صاحب
دھلوی سے مشورہ رہا ۔ پھر مرزا اسداللہ خاں غالب سے
تلمذ ہوا ۔ آخر بوضع استادان لکھنؤ موزوں فرمانے لگے،
منشی مظفر علی صاحب .... کلام دکھانے لگے
منشی امیر اللہ تسلیم نے تاریخ بدیع میں شاگردی مومن
کا حوالہ دیا ہے ۔ اس لیے ناظم نے غالب کو بطور
تصنع لکھا ہے کہ پہلی بار اصلاح لے رہا ہوں، ورنہ
دیوان مؤمن فارسی میں ایک قطعہ نواب یوسف علیخاں
کے ورود دھلی کے متعلق موجود ہے اور اس وقت وہ
ولیعہد ریاست تھے اس سے باھمی روابط کا پتہ چلتا ہے
۱۲۸۱ھ و ۱۸۶۴ء میں وفات پائی، دیوان مطبوعہ ہے۔

(۳۶) نسیم ، مرزا اصغر علی خاں دھلوی، مؤمن کے خاص
شاگردوں میں تھے ۔ غدر سے کچھ پہلے دلی چھوڑ کر
لکھنؤ آ بسے اور اپنی شاعری کا سکہ لکھنؤ والوں سے
منوا لیا ۔ کافی شاگرد پیدا کر لیے، ۱۲۸۲ھ میں وفات
پائی، دیوان مطبوعہ یادگار ہے۔

(۳۷) وحشت ، میرغلام علی‌خاں دھلوی، ولادت مرادآباد میں

اور ابتدائی تربیت بنارس اور دھلی وغیرہ میں ھوئی ، مولانا
رشیدالدین خاں کے داماد تھے ۔ مؤمن کے خاص شاگردوں
میں تھے اور شیفتہ سے انکی دوستی عشق کے درجہ تک
تھی ۔ غالب سے خصوصی تعلقات تھے اس مقطع میں
ان ھی کا ذکر ھے

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید
مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ھیں

مدتوں کمپنی کی ملازمت میں مسلک رھے پھر ریاست الور میں ملازم ھوگئے لکھنؤ بھی کچھ عرصہ رھے آخر میں سر رشتہ تعلیم میں ملازم ھوگئے تھے غدر کے بعد فوت ھوے ۔

(۳۸) **یاس** ۔ حکیم خیرالدین دھلوی مؤمن کے شاگرد تھے
اور شاہ نصیر کے مقابلے میں مؤمن نے ایک مرتبہ میں
مشاعرے میں انہیں آگے بڑھایا تھا ۔

از سیّد علی شاہ ملتانی

ملتانی زبان کیا ہے

(۱)

آج سے تقریباً تیس پینتیس سال قبل جناب حافظ محمود شیرانی صاحب نے " پنجاب میں اردو " لکھ کر ایک سیدھی سادی حقیقت کا اظہار کیا تھا کہ وہ زبان جسے ہم " اردو " کہتے ہیں دکن، بنگال یا یوپی کی پیداوار نہیں ہو سکتی ۔ آج ۱۹۶۹ء میں راقم سطور ھذا ملتانی زبان کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد پھر ایک مرتبہ اس سیدھی سادی تاریخی حقیقت کا اظہار کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ جسطرح سے مون سون ہوائیں خلیج بنگال سے اٹھ کر سارے ہندوستان کو سیراب و شاداب کرتی ہیں اسی طرح سے ہماری تہذیبی و ثقافتی ہوائیں بھی شمال مغربی ہندوستان سے اٹھتی اور پھر سارے ملک کو شاداب کر دیتی ہیں پس جسطرح سے مون سون ہواؤں کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسی طرح سے ان تہذیبی اور ثقافتی ہواؤں کے وجود سے بھی انکار ناممکن ہے ۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ " اردو " ہی پنجاب سے ہندوستان نہیں پہنچا ، بلکہ ہندی بھی یہیں سے ہندوستان میں پہنچی اور اس سے پہلے برہمن دیوتا کی دیو بانی یعنی سنسکرت بھی پنجاب کے میدانوں میں نازل ہوئی تھی ۔ ہزارہا سال تک یہیں پر پھولی پھلی اور آخر کار وادی گنگا میں اس نے اپنے قدم جمائے ۔

اردو ، هندی اور ملتانی وغیره کی اصلیت جاننے کے لیے همیں سد
سے پہلے سنسکرت کی اصلیت کا جان لینا نہایت ضروری ہے ۔ بد قسمہ
سے سنسکرت کے متعلق برهمنوں نے اس قدر غلط فہمی پھیلا رکھ
ہے کہ ابھی تک همیں صحیح صحیح طور پر یه بھی معلوم نہیں ،
سکا کہ وہ در اصل کس علاقے کی زبان تھی ؟ هندوستان میں کہ
پہنچی اور کیسے پہنچی ؟ کیا وہ اس ملک میں کبھی عوام کی بول چال بھ
بنی ؟ لہذا جب تک یه تمام حقایق منصّہ شہود پر نه آ جائیں حقیق
حال کا کچھ بھی پته نہیں چل سکتا ۔

اگر برهمنوں کی کتب کو دیکھا جائے تو انکے بیان کے بموجہ
سنسکرت ایک آسمانی زبان ہے جسے صرف دیوتا هی بولا کرتے تھے
پھر یه بولی آهسته آهسته برهمنوں نے سیکھ لی اور اب هندوؤں کی کتہ
مقدسه میں محفوظ ہے ۔

اسکے برخلاف یورپین محققین کا کہنا ہے کہ کاکیشیا ک
پہاڑوں میں آریه نام کی ایک سفید فام قوم آباد تھی جب وہ قوم اس
قدر بڑھ گئی کہ کاکیشیا کی حدود میں اس کے لیے رهنا بھی دشو
هو گیا تو وہ ملک سے باهر نکل کھڑی هوئی اور چہار اکناف
عالم میں پھیل گئی ۔ یورپین محقق اپنے اس نظریے کی تائید میں ا
آریائی زبانوں کو پیش کرتے هیں جو بنارس سے برلن تک پھیلی هوئ
هیں اور اپنی وحدت کی وجه سے آج بھی اپنے قارئین کو اچنبھ
میں ڈال دینے کے لیے کافی هیں ۔

اس سلسلے میں همارے برهمن دیوتا کا دعویٰ صحیح ہے یا ک

علماء علم‌السنہ کا ؟ ہم اپنے اس مضمون میں اسی حقیقت کو جاننے کی کوشش کریں گے - ثبوت کے لیے ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں - ملتانی زبان یہاں پر ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے - ہم اپنے قارئین کرام کو دلائل و براھین کے ساتھ بتائیں گے کہ ملتانی زبان میں سنسکرت الاصل الفاظ کی جو بھرمار ہے وہ کب، کیوں اور کیسے آئی ؟

اس سلسلہ میں ہمارا دل تو بہت چاھتا ہے کہ ہم دراوڑی زبانوں کے الفاظ بھی اپنے قارئین کرام کے سامنے پیش کرتے لیکن کالم زیادہ بڑھ جانے کے خوف سے اس کام کو ایک علیحدہ فصل پر محوّل کر دیا ہے - پھر بھی اس موقعہ پر ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا نہایت ضروری ہے -

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ملتانی زبان کی چند مخصوص آوازیں جنہیں ب ح ڈ گ کر کے لکھا جاتا ہے غالباً دراوڑی اصل کی ہیں- لہذا ملتانی زبان کبھی بھی آریائی نہیں ہو سکتی ! ! !

ہمیں بھی واقعی ان اصوات کی اصلیت جاننے کی بڑی خواہش ہے - کاش کوئی شخص اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کرے - لیکن جب تک تحقیق سے آنکی اصل معلوم نہ ہو ہم اتنی بڑی شہادتوں کو جو آنے والے صفحات میں آپکی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں اور جو کتنے ہی سنسکرت دان علماء کی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں کس طرح سے نظر انداز کر سکتے ہیں ؟

اگرچہ تقسیم سے قبل بھی کتنے ہی سنسکرت دان ہندو علماء نے

تحریراً اور تقریراً اس امر کا اظہار کیا تھا کہ ملتانی زبان ہندوستا
کی دوسری زبانوں کی بہ نسبت سنسکرت سے زیادہ قریب ہے ۔ تاہ
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کے لوگوں نے جنکی اکثریت دی
اسلام سے تعلق رکھتی ہے، اپنا دستور بنا لیا تھا کہ ہندوؤں کی کوئ
بات بھی تسلیم نہ کی جائے خواہ وہ حقیقت سے کتنی ہی قرین کیوں ن
ہو۔ اب پاکستان بن جانے کے بعد جب چند ایک سنسکرت دا
مسلمانوں نے بھی اس قسم کا نعرہ بلند کیا تو عوام بڑی حیرت سے ان
منہ تاکتے ہیں گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں کو ی
کیا ہو گیا ہے کہ آپ ایک اسلامی زبان کی شدھی کرنے پر ک
ہمت محکم باندھ رہے ہیں ؟

حقیقت یہ ہے کہ ملتانی زبان اس وقت عربی اور فارسی سے اس
قدر قریب ہو چکی ہے کہ اسے سنسکرت کی بیٹی کہتے ہوئے بھ
ڈر سا لگتا ہے ۔ اسی طرح سے ہندی ایک غیر آریائی زبان ہو ک
بھی سنسکرت سے اس قدر قریب ہو گئی ہے کہ ہمارا یہی کہ
بھی کہ ہندی ایک غیر آریائی زبان ہے بعض لوگوں کو عجیب و غریب
معلوم ہوگا ۔

لہذا اس تمام جھگڑے کو نپٹانے کے لیے ہم ان ابتدائی اصولو
سے امداد لینگے جو علماء علم السنہ نے دو زبانوں کی باہمی قرابہ
معلوم کرنے کے لیے وضع کئے ہیں :-

علمائے علم السنہ کا کہنا ہے کہ دو زبانوں کی باہمی قرابہ
ثابت کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے انکی صوتیاتی ہم آہنگی ثابہ
کرنی چاہیے یعنی انکی الفباء ایکدوسرے سے ملتی جلتی ہو ۔

اس سلسلے میں دوسری شرط یہ پیش کی گئی ھے کہ انکے بنیادی اور روزمرہ کے استعمال میں آنیوالے الفاظ کی فرہنگ ایکدوسرے سے ملتی جلتی ہو ۔

تیسری شرط یہ ھے کہ انکی صرف و نحو بھی ایکدوسرے سے مماثلت رکھتی ہو ۔

اس سلسلہ میں ان علماء نے اس تیسری شرط کو نہایت ضروری اور اھم قرار دیا ھے ۔ کیونکہ الفاظ تو کوئی بھی زبان کسی زبان سے جب چاھے اور جسقدر چاھے عاریۃً لے سکتی ھے ۔

سنسکرت اور ملتانی زبان کی صوتیاتی ہم آہنگی ۔ اگرچہ سنسکرت اور پالی زبان سے ملتان کے لوگوں کے مذھبی رشتہ کو منقطع ہوئے ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ گذر چکا ھے ۔ تاھم ھماری الفباء اب بھی سنسکرت زبان سے ملتی جلتی ھے ۔ ری ۔ رّی، اور لری لرّی کو چھوڑ کر باقی تمام حروف ھماری زبان میں پائے جاتے ھیں حتٰی کہ ''انگ،، اور ''انج،، بھی ۔ اسکے برخلاف ھندی زبان میں ان دو آوازوں کا فقدان ھے ۔ چنانچہ یو ۔ پی کے باشندے چنگاں کو چنگا کہہ کر ھی بولتے ھیں ۔

روز مرہ کے استعمال میں آنیوالے الفاظ کی وحدت ۔ روز مرہ کی گفتگو میں سب سے پہلے کھانے پینے کی چیزوں کا نمبر آتا ھے اسکے بعد قرابت اور رشتہ داری کا۔ اس کے بعد انسانی بدن اور ارضی و سماوی اجرام کا ۔ لہذا ھم بھی اس سلسلہ میں جو فرہنگ پیش کریں گے وہ اسی ترتیب سے ھوگی ۔

فرہنگ اشیائے خوردنی و نوشیدنی

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	ہندی
پانی	اسو	آب	ابو	—
دودھ	اکھشیرہ	شیر	کھیر	دودھ
بھات	بھکتم	—	بھت	بھات
روٹی	پوپ	—	پوا	روٹی
لقمہ	گراسم	—	گرانہ	گرائی
پیاس	ترس	تسنگی	ترہ	پیاس
باسی (روٹی)	پراتھمک	—	سروبھی	باسی
تازہ (روٹی)	سدیہ	—	سجی	—

فرہنگ الفاظ قرابت و رشتہ داری

اماں	امبا	—	اماں امڑی	—
ماں	ماتری	مادر	ما	ماں
بھائی	بھرانری	برادر	بھرا	بھائی
بیٹا	پترہ	پسر	پتر	بیٹا
بیٹی	دوھتری	دختر	دھی	بیٹی
بھتیجا	بھرانری جا	برادر زادہ	بھتریجا	بھتیجا
بھانجا	بھگنی جا	خواہر زادہ	بھنجا	بھانجا
نواسہ	دوھترا	—	دوھترا	نواسہ
داماد	جامانری	داماد	جوانترا	جوائی
نند	ننانڈری	—	ننان	نند
سگا	سوک	—	سکا	سگا
اپنا	سوجن	—	سجن	ساجن
بہو	اسنوسا	—	نونہہ	بہو
ساس	شوشرو	—	سس	ساس

فرہنگ الفاظ متعلقہ بہ اعضائے انسانی و حیوانی

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	ہندی
چمڑا	چرمن	چرم	چم	چام
تھن	استھن	—	تھن	تھن
ماتھا	مستکم	—	متھا	ماتھا
کان	کرنہ	گوش	کن	کان
جبڑا	ہنو	—	ہڑاب ہنو	جبڑا
بازو	باھو	بازو	بانہہ	باں
ہاتھ	ہست	دست	ہتھ	ہاتھ
دھان	و نترم	دھان	وات	—
زبان	جیہبہ	زبان	جبھ	جیبھ
ٹانگ	جنگھ	زانو	جنگھ	جانگھ
بغل	ککھشا	—	کچھ	کوکھ
آنتیں	انترانی	—	آندراں	آنتیں
بلغم	اشلیشمر	—	لم	—
پیپ	پویم	ریم	پوں	پیپ
لہو	رکت	خون	رت	لہو
رال	لالا	—	لا لاں	لار
پر	پکھش	پر	پکھ	پنکھ
چونچ	چنچو	منقار	چنج	چونچ
آنکھ	اکھشی	چشم	اکھ	آنکھ
چربی	میدسوں	پیہ	سینٹبھ	چربی
پھیپھڑا	پھپھس	—	پھپھڑ	پھیپھڑا
ہتھیلی	تلم	—	تلی	ہتھیلی

فرهنگ الفاظ متعلقه به اجرام ارضی و سماوی

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	هندی
زمین	بھومی	بوم	بھوئیں	بھوئی
آگ	آگنی	آتش	آگ	آگ
آگ (روشنی)	بھا	—	بھا	—
چاند	چندر	ماه	چندر	چاند
مشرق	پورو اردھ	—	پوادھ	پورب
مغرب	پنچم آردھ	—	پچادھ	پچھم
جنوب	دکھن	—	دکھن	دکن
شمال	اتر بھاک	—	اپھا	اتر
گرمی کا موسم	اشن کالا	—	اپھالا	گرمی
سردی کا موسم	شیت کالا	—	سالا	سردی
موسم	رتو	—	رت	رت
کیچڑ	چکل	—	چکڑ	کیچڑ
کہرا	کہرکا	—	کہیڑ	کہرا
دن	دوس	روز	ڈینہ	دن
بجلی	ودیت	—	وج	بجلی

چند روزمره استعمال میں آنیوالے الفاظ

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	هندی
مکان	شاله	—	سال	شاله
چولک	چولک	—	چولا	کرتا
بھینس	مہشی	میش	مینہ / مجھ	بھینس
سینگ	شرنگم	شاخ	سنگ	سینگ
کھیت	کھیترم	—	کھیتر	کھیت
چولہا	چلّی	—	چلھہ	چولہا

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	هندی
پتا	پترم	—	پتر	پتا
خبردار	سسه بنسبه	—	پوشا بوشا	—
بار برداری ؛ جانور یا جهاز	وهر	—	وهر	—
تکلا	ترکک	—	ترکلا	تکلا
درانتی	داترم	داس	ڈاتری	درانتی
بھیڑ	بھیڈ	میش	بھیڈ	بھیڑ
بکری	چھبلیکا	—	چھبلی	چھبری
گائے	گو	گاو	گاں	گائے
بچھڑا	وسیه	گوساله	وچھا	بچھڑا
مچھلی	مسیه	ماهی	مچھی	مچھلی
مگرمچھ	شسومار	—	سسار	سنسار
چھینکا	شکیه	—	چھکا	چھینکا
مرغا	ککٹه	مرغ	ککڑ	مرغا
پرنده	پکھسی	برنده	پکھی	پنچھی
آج	ادیه	امروز	اج	آج
کل	شوس	فردا	سبماهیں	—
انگھوٹھی	مدرا	—	مندری	انگھوٹھی
سانس	شواس	—	ساہ	سانس
سوت	سوترم	—	سٹر	سوت
تین	تری	سه	ترے	تین
پانچ	پنچن	پنج	پنج	پانچ
سات	سپتن	هفت	ست	سات

هم نے مذکورہ بالا فہرست میں اندازۂ ستر بچہتر الفاظ کی رہنگ پیش کی ہے - آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ ملتانی زبان حتی الوسع سنسکرت کی ہر آواز کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے - مزید بر آں اس فہرست میں آمدہ " ہتھ "، " ہاتھ "، اور " اکھ"، آنکھ کے قبیل کے الفاظ بھی ہماری توجہ کے خصوصیت سے مستحق ہیں - سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندی نے واقعی بہ الفاظ براہ راست سنسکرت سے لیے ہیں - تو ملتانیوں کی تقلید کیوں کی گئی ہے ؟ ملتان کے لوگ جو ہست کو " ہتھ"، اور اکھشی کو " اکھ "، بولتے ہیں تو اسکی خاص وجہ ہے یعنی وہ س، ش کا تلفظ نہیں کر سکتے یا کرنا نہیں چاہتے - لیکن ہندی کی صورت حال اسکے بر عکس واقع ہوئی ہے ہندی میں سنسکرت کے س، ش کو بڑی سہولت سے بولا جا سکتا ہے -

آخر میں هم اپنے قارئین کرام کی توجہ وات (دھان) او سبھاھیں (فردا) کی طرف مبذول کرائیں گے کیا کوئی صاحب انکے ہندی مترادفات بھی بتا سکتے ہیں ؟

ملتانی زبان کیا ہے

اس حقیقت کا اظہار پہلے بھی ہو چکا ہے کہ دو زبانوں کی قرابت ثابت کرنے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ انکی صر و نحوی قرابت بھی ثابت کی جائے - کیونکہ الفاظ تو دنیا کی کوئی بھی زب کسی زبان سے لے سکتی ہے - لہذا ہم اس حصہ میں کچھ اید شواهد پیش کریں گے جو ملتانی زبان کی سنسکرت سے صرفی و نحو قرابت اچھی طرح سے ثابت کر سکیں -

صرف و نحو میں سب سے پہلا نمبر مصادر کا آتا ہے - یوں ہندی بھی اپنے مصادر سنسکرت سے لیتی ہے مگر ملتانی کا مصادر ا

کا طریقہ ھی نرالا ھے ۔ وہ سنسکرت کے مصادر کو اس طرح سے اپناتی ھے جیسے کہ اس کا اپنا مال ھیں ۔ اسکے برخلاف ھندی ان مصادر کو لے تو لیتی ھے مگر منہ بنا بنا کر ۔ اگر آپ کبھی ملتان گئے ھوں تو پرنیوں ۔ پرینجن وغیرہ کے الفاظ آپنے ضرور سنے ھونگے ۔ پرنیوں کا مصادر سنسکرت Pri اور Ni سے نکلا ھے اسکے معنے ھیں کسی کا ھاتھ پکڑ کر لے جانا اور یہ صرف بیاہ میں ھی ھو سکتا ھے ۔ لہذا اسکے معنے ھوے بیاہ کر کے لے جانا ۔ اب اگر آپ کسی ملتانی سے پوچھیں کہ آپ کی شادی ھو چکی ھے ؟ تو آپ کہیں گے '' توں پر نیا ھویا ایں ،، ؟ اگر وہ جواب دے کہ میری شادی نہیں ھوئی تو آپ کو پھر سوال کرنا ھوگا '' کڈاں پرنیسیں ،،؟ یعنی کب بیاہ کروگے؟ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ مصدر برھمنوں کا لایا ھوا ھے تو بھی اتنا تو ضرور تسلیم کرنا پڑیگا کہ برھمنوں نے اسے ایک عوامی لفظ بنا کر چھوڑا ۔

ھم نے اپنی فہرست میں زیادہ مصادر نہیں دئے ۔ ترتیب کا بھی زیادہ دھیان نہیں رکھا تاھم آپ دیکھینگے کہ اس چھوٹی سی فہرست میں بھی کتنے مصادر ایسے ھیں جنکے ھندی مترادفات نہیں ملتے یا پھر سنسکرت الاصل نہیں :-

ملتانی اور سنسکرت مصادر کی فرہنگ

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	ھندی
کہنا	آ ۔ کھبہ	گفتن	آکھن	کہنا
لانا	آ ۔ نی	آوردن	آنن	لانا
بیٹھنا	وش	نشستن	بہن	بیٹھنا

ڈوبنا	برڈ	—	بڈن	ڈوبنا
توڑنا	بھنج	شکستن	بھنن	توڑنا
بیاہ رچانا	دری ـ نی	—	پرنیوں	—
اندر داخل ہونا	دروش	—	سہن	—
مزے اڑانا	بھوگ	—	بھوگن	—
پوچھنا	پرچھ	پرسیدن	پچھن	پوچھنا
چھیلنا	تکھش	—	تچھن	چھیلنا
تاننا	تن	تنیدن	تنن	تاننا
ترنا	تری	شنا کردن	ترن	تیرنا
ٹوٹنا	ترٹ	—	ترٹن	ٹوٹنا
جینا	جیو	—	جیون	جینا
جڑنا (لگنا)	جٹ	—	جٹن	جٹنا
جڑنا (ملنا)	جڈ	—	جڑن	جڑنا
جھوٹنا	چھٹ	—	جھٹن	چھوٹنا
چھونا	چھپ*	—	جوھن	حھونا
جھڑنا	ا کھشر	—	جھڑن	جھڑنا
چاہنا	حرب	حاہیدن	حہن	جاہنا
دکھائی دینا	درش	—	ڈسن	دیکھنا
رکنا	ردھ	—	ردھن	رکنا
سینا	سو	—	سیون	سینا
سوجنا	شوی	—	سجن	سوجنا
صاف کرنا	شدھ	—	سودھن	—
ڈھانپنا	ڈھک	—	ڈھکن	ڈھانپنا

*سنسکرت کا ”پ“ ملتانی میں ”ہ“ سے بھی بدل سکتا ہے جیسے کوپ (کنواں) سے کھوہ۔

جمع کرنا	سنچ	—	سنجن	—
گرنا	گری	—	گرن	گرنا
اردو	**سنسکرت**	**فارسی**	**ملتانی**	**ہندی**
گانٹھنا	گرنتھ	—	گنڈھن	گنٹھنا
ڈھیلنا	ڈربند	بازدن	ڈھبڈن	ڈھیلنا
صدا کرنا	شبد	صدا کردن	سڈن	—
روٹھنا	رس	—	رسن	روٹھنا
گوندھنا (آٹا)	مرد	مالیدن	ملن	گوندھا
الگ کرنا	نر - کُنس	—	نکھیڑن	—
نچوڑنا	نی - پیڑ	—	نپیڑن	نچوڑنا
نکلنا (پتوں کا)	نی - سری	—	نسرن	—
کمزور ہونا / بوڑھا ہونا	نی - جری	—	نجھرن	—
جانا	وی	—	ونجن	جانا
بسنا (رہنا)	وس	—	وسن	بسنا
برسنا	ورتی	باریدن	وسن	برسنا
نرم ہونا	مسرن	—	مسرن	—
لوٹ لینا	مش	—	مچھن	—
جوڑنا	سندھ	—	سندھن	—
چلنا	پرجول	—	پچلن	—
بھیجنا	پریش	فرستادن	پٹھن	بھیجنا
لپیٹنا	وی - لٹھ	—	ولیھٹن	لپیٹنا
بڑھنا	وردھ	—	ودھن	بڑھنا
بھولنا	وسمری	—	وسرن	بسرنا
پانا	لبھ	—	لبھن	پانا

کری کی امداد سے بنائے گئے مصادر

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	ھندی
اڑنا	ابڑ - کری	—	اڑکن	اڑنا
آنکھ کا جھپکنا	اسھر - کری	—	بھرکن	—
تھوکنا	انشھو - کری	—	نھکن	تھوکنا
ٹرٹرانا	ٹر - کری	—	ٹرکن	ٹرانا
کھینچنا	آ کرش - کری	کشیدن	چھکن	کھینچنا
حمکنا	حمت - کری	—	چمکن	چمکنا
ڈرانا	در - کری	—	دڑکن	ڈرانا
دوڑنا	دھور - کری	دویدن	دھرکن	دوڑنا
اعتراف کرنا	سوی - کری	—	سولن	—
انکار کرنا (مکرنا)	ما - کری	—	مکرن	مکرنا
چاٹنا	لیھ - کری	لیسدن	اکن	جاٹنا
چھڑنا	مسرن - کری	—	مکھن*	چپڑنا

*ملتانی زبان میں مکھن کے دو معنی ھیں (اول) مکھن جسکے لیے کلاسیکل سنسکرت میں نونیتم کا لفظ آتا ھے - (دوم) جبڑنا جیسے اماں روٹی مکھ ڈے (ماں روٹی جپڑ دے) اگر ھمارا یہ مفروضہ صحیح ھے تو مکھن کا ماخذ بھی ھمیں معلوم ھو گیا یعنی یہ لفظ بھی ملتانی سے ھی ھندوستان کی دوسری زبانوں میں پہنچا ھے -

زمانۂ حال کی مطابقت - مصادر کے بعد زمانہ حال کی نوبت آتی ھے - حال کے صیغوں میں بظاھر ھندی کا پلہ بھاری نظر آتا ھے - کیونکہ وہ سنسکرت کے ”ت“ کو برقرار رکھتی ھے - لیکن یہ قرابت بھی محض سطحی ھے - اصل سوال حقیقی بناوٹ سے تعلق رکھتا ھے -

یعنی جہاں سنسکرت کا '' پٹھتی ،، اور ملتانی کا '' پڑھدے،، تصریفی (Synthetic) کلمے ہیں ۔ وہاں '' پڑھتا ہے ،، ایک غیر تصریفی (Analytical) کلمہ ہے۔ اور جب تک اسکے ساتھ 'وہ، 'تم، نہ لکھے جائیں اسکے معنی ہی واضح نہیں ہوتے ۔ آپ کی آسانی کے لیے یہ فرق ایک جدول کے ذریعے واضح کیا جاتا ہے :

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	ہندی
وہ کرتا ہے	کروتی	کند	کریندے	کرتا ہے
وہ کرتے ہیں	کرونتی	کنند	کریندن	کرتے ہیں
تو کرتا ہے	کروشی	کنی	کریندین	کرتا ہے
تم کرتے ہو / آپ کرتے ہیں	کرونھ	کنید	کریندوئ	کرتے ہیں
میں کرتا ہوں	کرومی	کنم	کریندان	کرتا ہوں
ہم کرتے ہیں	کرمہ	کنیم	کریندیسے	کرتے ہیں

زمانہ مستقبل کی مطابقت ۔ اس وقت ہندوستان کی زبانوں میں گجراتی اور راجستھانی کے علاوہ ملتانی ہی ایک ایسی زبان ہے جسکے مستقبل کے صیغے سنسکرت سے ملتے جلتے ہیں ۔ بہت جستجو کرنے پر بھی '' مجھے '' گا ،، کے لاحقے کی اصلیت معلوم نہیں ہو سکی ، خیال ہے کہ یہ ہندوستان کی کسی اصلی زبان سے ہی لیا گیا ہوگا۔ سنسکرت سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں ۔ کسی زمانے میں اردو میں بھی '' گا ،، کی بجائے ''سی،، استعمال ہوتا تھا مگر بعد میں ترک کر دیا گیا ایسا کرنے کی کوئی وجہ بھی معلوم نہیں ہوتی ۔ ہمیں اردو کے قدیم شاعروں کے کلام میں چند ایک ایسے اشعار ملے ہیں جن میں '' گا ،،

کی بجائے "سی" استعمال ہوا ہے اور نمونۃً درج ہیں :-

(۱) کدھیں سیج سکھ سنگ ملسی نہ منجھ
کدھیں من کمل پھول کھلسی نہ منجھ
(لیلی مجنوں احمد دکنی)

(۲) کہا ہے زہر کا تاثیر ص میں
نہ چلسی کچھ مرا تدبیر اس میں
(روضۃ الشہدا ولی دکنی)

(۳) توں جسکو بھاوے جوڑ
نہ جاسی یہ گن چھوڑ
(میرانجی شمس العشاق)

جدول مستقبل

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	ھندی
میں کرونگا	کرشیامی	خواھم کرد	کریساں	کروں گا
ھم دیں گے	داسیامہ	خواھیم داد	ڈیسوں	دیں گے
تو پڑھیگا	پتھسیسی	خواھی خواند	پڑھسیں	پڑھوگے
تم کھاؤگے	بھوکسیدھوے	خواھید خورد	کھاسو	کھاؤگے
وہ مریگا	مرسیتی	خواھد مرد	مرسی	مریگا
وہ لینگے	گھریشینتی	خواھند گرفت	گھنسین	لینگے

اسم مفعول یا ماضی مطلق کی وحدت۔ ملتانی زبان اور سنسکرت کے اسمائے مفعول آپس میں بڑے ھی ملتے ھیں۔ چونکہ یہ اسم سنسکرت میں زیادہ تر بے قاعدہ ھی آتا ہے ملتانی میں بھی اکثر بے قاعدہ ھوتا

ھے ۔ لطف یہ ھے کہ جہاں سنسکرت زبان جیسی مکھی مارتی ھے ملتانی بھی ویسی ھی مکھی مارتی ھے تا کہ نقل مطابق اصل ھو۔ کچھ مثالیں درج ذیل ھیں :۔

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	ھندی
دیکھا ھوا	درشٹہ	دیدہ	ڈٹھا	دیکھا
پیا ھوا	پینہ	—	پیتا	پیا
روٹھا ھوا	رشٹہ	—	رٹھا	روٹھا
پایا ھوا	لبدھا	یافتہ	لدھا	پایا
بھیجا ھوا	پرستھتہ	فرستادہ	پٹھیا	بھیجا
سویا ھوا	ستہ	خفتہ	ستا	سویا
کیا ھوا	کرتہ	کردہ	کیتا	کیا
دیا ھوا	دتہ	دادہ	ڈتہ	دیا
داخل شدہ	پروشٹہ	—	پیٹھا	—
شکستہ	بھگن	شکستہ	بھنا	ٹوٹا ھوا
باندھا ھوا	بدھ	بستہ	بدھا	باندھا
جیتا ھوا	جتہ	—	جتیا	جیتا
لے جایا گیا	نیتہ	—	نیتا	لے جایا گیا
جانا ھوا	جیاتہ	—	جاتا	جانا ھوا

اسم فائل تصریفی ۔ یہ حقیقت شاید بہت ھی کم لوگوں کو معلوم ھوگی کہ ملتانی زبان میں اسم فاعل ترکیبی کے علاوہ اسم فاعل تصریفی بھی پایا جاتا ھے ۔ یہ اسم فاعل ملتانی میں سنسکرت سے آیا ھے ۔ حوالے کے لیے چند الفاظ درج ھیں ۔ ملتانی میں مصدر سے اسم فاعل تصریفی بن سکتا ھے ۔

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	هندی
دینے والا	داتری	دهنده	ڈیندر	دینے والا
جیتنے والا	جیتری	—	جتیندڑ	جیتنے والا
دیکھنے والا	درشٹری	بیننده	ڈیہدڑ	دیکھنے والا
سننے والا	ستروتری	شنونده	سنندڑ	سننے والا
کرنے والا	کرتری	کننده	کُریندڑ	کرنے والا

صفات کی وحدت

آسان	سوکر	—	سوکھا	—
مشکل	اسوکر	—	اوکھا	—
ویران	شونیه	—	سنج	—
تیز	تیکھشن	تیز	تکھا	تیکھا
سرخ	رکت	—	رتا	لال
گرم	تپته	—	نته	گرم
اونچا	اچ	اوج	اچا	اونچا
موٹا	استھول	—	ٹھلا	—
اگلا	اگر	—	اگلا	اگلا
مجھلا	مدھیه	—	منجھلا	مجھلا
چھوٹا	اکھشودشٹھ	خورد	چھوٹا	چھوٹا
بہت	بہو	بسیار	بہوں	بہت
روکھا	رکھشا	—	رکھا	روکھا
نزدیک	نیدھشٹ	—	نیڑے	—
دیر	چرم	—	چر	—

حرف ھائے ربط و اسمائے اشارہ وغیرہ کی وحدت

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	ھندی
اور	اتھ	و	آتیں	اور
کب	کدا	کے	کڈاں	کب
جب	یدا	چوں	جڈاں	جب
تب	تدا	—	تڈاں	تب
اسا	ابوم	ایں چنیں	اینویں	ایسا
اس طرح کا	ای درش	ایں چنیں	ایجھاں	—
کتنا	کتی	چند	کتیں	کتنے
کیسا	کادرش	چہ طور	کیجھاں	کیسا
یہاں	اتر	ایں جا	اتھاں	یہاں
کہاں	کتر	کجا	کتھاں	کہاں
جہاں	یتر	—	جتھاں	جہاں
کے لیے	کرتے	برائے	کیتے	کے لیے
جس نے	ییں	—	جیں	جس نے
کس نے	کین	—	کیں	کس نے
میرا	مدیہ	—	میڈا	میرا
تیرا	تودیہ	—	تیڈا	تیرا
ھمارا	اسمدیہ	—	اساڈا	ھمارا
تمہارا	یشمدیہ	تساڈا	تساڈا	تمہارا
کونسا	کتر	—	کیہڑا	کونسا
وہ	سہ	—	ھو (او)	وہ

وبھکتیوں یعنی حالتوں کی وحدت ۔ اردو اور ھندی کی وبھکتیوں (حالتوں) کا سنسکرت زبان سے کچھ زیادہ تعلق نہیں ۔ ناگری پرچارنی

سبها (کاشی) کے پنڈتوں نے تو صاف کہ دیا ہے کہ بھائی سنسکرت اور هندی کی وبھکتیوں کی تطبیق کا کام همارے بس کا روگ نہیں (دیکھو ناگری پرچارنی پتریکا جلد پنجم صفحه ۳۹۲ - بیچارے اس کے سوائے وہ جواب بھی کیا دے سکتے تھے - جب کسی شخص کو کسی زبان کی ارتقائی کڑیوں کا علم نه هو تو وہ اناپ شناپ باتیں بنانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے -

اس سلسله میں اهل ملتان بڑے خوش نصیب هیں - ملتانی زبان کی حالتیں اگرچه هو بهو سنسکرت کی طرح نہیں تاهم اس سے بیحد ملتی جلتی هیں - مثال کے لیے هم نے "میں - کو - جو - سب اور ایک اسم راجا " کی گردانیں ایک جدول میں درج کر دی هیں - نیچے انکی ساخت کے متعلق بھی تشریح کر دی ہے - امید ہے که اس جدول سے اردو دان طبقه بھی فائدہ اٹھائیگا - کیونکه هم نے " نے - کو - کا - کے - کی "کے لاحقوں سے تو پردہ اٹھا دیا ہے - باقی رہ جاتے هیں " سے - لیے وغیرہ تو هماری تحقیق کی روشنی میں ان سے بھی پردہ اٹھ سکتا ہے -

جدول حالات

کام حالت کا	واحد		جمع	
	سنسکرت	ملتانی	سنسکرت	ملتانی
فاعلی و آلی	اهم - میا	میں	ویم - اسمابهی (اسمان)	اساں
	که - کین	کیں	کے - کیه	کنهاں

نام حالت کا	واحد — سنسکرت	واحد — ملتانی	جمع — سنسکرت	جمع — ملتانی
	یہ - یین	جیں	یے - یہشہ	جنہاں
	سروہ - سروین	سبھنیں	سروے - سرویؒ	واحد کا صیغہ ہی مستعمل ہے
	راجا - راجیا	راجا	راجانہ - راجبھی	راجاں
مفعولی	مام (مم کم)	میکوں	اسمان (اسما کم)	اسا کوں (لاہوری اسانوں)
	کم	کیکوں	کان	کنہیں کوں (لاہوری کنہاں نوں)
	یم	جیکوں	یان	جنہیں کوں (لاہوری جنہاں نوں)
	سروم	سبھنیں کوں	سروان	واحد کا صیغہ ہی مستعمل ہے
	راجا نام	راجے کوں	راجیا	راجیں کوں
انفکا کی یا مفعول منہ	مت	میکنوں (لاہوری میتھوں)	اسمت	اسانکنوں (لاہوری اسانتھوں)
	کسمات	کینکنوں (لاہوری کس تھوں)	کیبھیا	کنہیں کنوں (لاہوری کنہاں تھوں)
	یسمات	جینکنوں (لاہوری جس تھوں)	ییبھیا	جنہیں کنوں (لاہوری جنہاں تھوں)

نام حالت کا	واحد: سنسکرت	واحد: ملتانی	جمع: سنسکرت	جمع: ملتانی
	سرو سباہ	سبھنیں کنوں	سرویبھیا	سبھنیں کنوں (لاھوری سبھناں تھوں)
	راجیا	راج کنوں	راجبھیا	راجیں کنوں (لاھوری راجباں تھوں)
اضافی و تملیکی	مم (مدیہ)	میڈا	اسماکم (اسمدیہ)	اساڈا
	کسیہ	کیندا	کیسام	کھنندا
	یسیہ	جیندا	یشام	جنہیندا
	سروسیہ	سبھنیں دا	سرواسام	سبھنیں دا
	راجیا	راجے دا	راجنام	راجیں دا
ندائی	راجن	راجنا	—	راجنو

جدول پہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتانی زبان میں چوتھی (مفعول لہ) اور ساتویں (مفعول فیہ) وبھکتیاں (حالتیں) نہیں پائی جاتیں ۔ تاہم اس سلسلہ میں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ان حالتوں کی ترکیب سنسکرت سے ہی لی گئی ہے ۔ چنانچہ جب ایک ملتانی کہتا ہے کہ میڈے کیتے پانی آنو (میرے لیے پانی لاؤ) تو وہ در اصل مدییم کرتے پانیم آنیہ ہی بول رہا ہوتا ہے جو ایک طرح کی بگڑی ہوئی سنسکرت ہے۔ ملتانی زبان کا وچ (بیچ ۔ میں) بھی سنسکرت کا لفظ ہے ۔ حالت ظرفی اسی کی مدد سے بنائی جاتی ہے ۔

اب هم ملتانی زبان کی حالتوں کے مآخذ اپنے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے هیں امید هے که قارئین نے جدول کا مطالعه دقت نظر سے کیا هوگا ۔ سب سے زیاده قابل غور حالت حالت اضافی هے ۔ سنسکرت زبان میں میرا کے لیے دو کلمے پائے جاتے هیں اول مم دوسرا مدیه ۔ مم حالت اضافی هے اور مدیه ضمیر تملیکی ۔ جب ملتان کے عوام کی زبان مرور زمانه سے بدل گئی تو انهوں نے مدیه کو حالت اضافی (میرا ۔ تیرا) کے لیے بولنا شروع کر دیا اور اسماکم (جمع مم) کو حالت مفعولی کے لیے جس سے میکوں ۔ اساکوں (مجھکو ۔ همکو) کے کلمے وجود میں آئے ۔

اسی طرح سے حالت هائے فاعلی اور آلی میں تمیز کرنا بھی عوام کے بس کا روگ نهیں تھا ۔ انهوں نے سنسکرت کی حالت فاعلی تو ترك کر دی اور حالت آلی سے حالت فاعلی کا کام لینے لگے چنانچه یین سے جیں بنا ۔ کیں سے کیں ۔ ان دونو لفظوں کی تقلید میں ''میا'' سے بھی '' میں '' بنا لیا گیا ۔ چونکه '' میں '' حالت آلی کا صیغه هے اسی لیے ملتان کے لوگ میں کے بعد '' نے '' کا لاحقه نهیں لگاتے ۔

مفعول منه کے لیے ملتانی کا لاحقه '' کنوں '' آتا هے ۔ مجھے ابھی تک اس لاحقے کی اصلیت معلوم نهیں هو سکی تاهم لاهوری زبان کا لاحقه '' تھوں '' یا '' توں '' سنسکرت زبان سے ملتا جلتا هے ۔ لهذا هم وثوق سے کهه سکتے هیں که '' ت '' کا لاحقه بھی ابھی تک هماری زبان میں موجود هے ۔ اسان (هم) کا کلمه اسمان کا اپ بھرنش (بگاڑ) هے ۔

ملتانی زبان کے سوا هندوستان کی کسی بھی زبان میں سنسکرت

سے ملتی جلتی حالت ندائی نہیں پائی جاتی ۔ ملتانی زبان میں لوگوں کے نام اب بھی راجن، کرمن، شرفن ۔ سیدن ۔ جیون ۔ جندن وغیرہ ہوتے ہیں ۔ حالت ندائیہ میں انہیں راجنا، کرمنا ۔ شرفنا الخ کہہ کر پکارا جاتا ھے جو ہو بہو سنسکرت کی نقل ھے ۔

صوتی وحدت ۔ بعض لوگوں کا خیال ھے کہ ہندی، گجراتی اور مرہٹی زبانیں سنسکرت کی آوازوں کو ملتانی سے زیادہ اپنی اصلی حالت میں برقرار رکھتی ہیں ۔ یہ غلط فہمی ''دس '' اور 'دہ' ''کرتا ھے'' اور '' کریندے '' کی وجہ سے پیدا ہوئی ھے ۔ ملتانی زبان بیشک سنسکرت کے '' س '' کو '' ہ '' سے اور '' ت '' کو '' د '' سے بدل دیتی ھے مگر شروع کلمہ میں نہیں ۔ اگر سنسکرت کا کوئی کلمہ '' ت '' سے شروع ہوتا ہو تو ملتانی میں بھی '' ت '' سے ہی شروع ہوگا ۔ اگر س ش سے شروع ہو تو ملتانی میں بھی اکثر س سے ہی شروع ہوگا ۔ کیونکہ '' ہ '' اور '' ت '' کا تغیر آخر یا وسط کلمہ میں ہی کیا جاتا ھے ۔ اور یہ کوئی عیب نہیں خود سنسکرت بھی اسی طرح سے کرتی ھے ۔ اب ہم ایک جدول میں ایسے الفاظ کی فرہنگ پیش کریں گے جن میں ملتانی سنسکرت کی آوازوں کو ہو بہو برقرار رکھتی ھے ۔

سنسکرت کی واؤ کو ہو بہو رہنے دیا گیا

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	ہندی
دشمنی	ویرم	—	ویر	بیر
بہوار	ویوہار	—	وہوار	بیوہار
بھیس	ویش	—	ویس	بھیس
بھروسہ	وشواش	—	وساہ	بساہ

سنسکرت کی ''جاں'' کو برقرار رکھا گیا

مونج	منج	—	منج	مونج
چونج	چنجو	—	حنج	حونج

چھوٹے یا نصف ''ر'' کو برقرار رکھا گیا

چاند	چندر	—	چندر	چاند
بیٹا	پتر	پسر	پتر	پوت

ڑان کو برقرار رکھا گیا

نمک	لون	نمک	لون	نون

مضمون کے خاتمے پر ہم چند ایسے الفاظ بھی قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دینا نہایت ضروری سمجھتے ہیں جو ہندی میں جا کر بگڑ گئے ہیں اس سلسلہ میں ہمیں بے حد افسوس ہے کہ فی‌الحال تین چار الفاظ سے زیادہ پیش خدمت نہیں کئے جا رہے :-

اردو	سنسکرت	فارسی	ملتانی	ہندی
برات	نادرم	---	داتری	برات
درانتی	داترم	داس	داتری	درانتی
ڈوبنا	برد	--	بڈن	ڈوبنا
کیچڑ	حکل	—	چکڑ	کیچڑ

کتابیات

(۱) سنسکرت گرامر فار بگنرس از میکس مولر

(۲) ہائر سنسکرت گرامر سوم ایڈیشن از ایم آر کالے

(۳) بھاشا شبد کوش موٴلفہ پنڈت رام شنکر شکل

(۴) اے ڈ شنری آف اردو، کلاسیکل ھندی
اینڈ انگلش از جان ٹی پلیٹس

(۵) پنجاب میں اردو از جناب حافظ محمود شیرانی

(۶) دی میکنگ آف پنجابی از دیوان نرائن دت اپّل

(۷) اے مینیول آف پالی از سی - وی جوشی (پونا)

تبصرہ

دائرہ معارف اسلامیہ

اردو دائرہ معارف اسلامیہ نے پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی زیر ادارت حال ھی میں دو اجزاء ٹائپ میں نہایت عمدہ کاغذ پر شائع کیے ھیں - یہ چار اجزا یا کراسے ایک ضخیم و عظیم دائرہ معارف کے اولین مطبوعہ حصے ھیں، جن کی تدوین گزشتہ دس سال سے پنجاب یونیورسٹی میں ھو رھی ھے - توقع ھے کہ مکمل دائرہ معارف ۱۲ جلدوں پر مشتمل ھوگا - اور اس کی اشاعت پر ۵ لاکھ روپے صرف ھوں گے - اسلام کی یہ اردو انسائکلوپیڈیا بہت حد تک اس انسائکلوپیڈیا آو اسلام پر مبنی ھے، جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۸ء تک کم و بیش تیس برس کی محنت سے مرتب ھو کر لائڈن سے شائع ھوتی رھی، اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی زیر ترتیب ھے - یہ اسلامی تاریخ و تہذیب اور اسلامی علوم کا ایک ایسا قیمتی ماخذ ھے اور ایسی ناگزیر کتاب حوالہ ھے جس کی قدر و قیمت علمی دنیا میں متفقہ طور پر تسلیم شدہ ھے - اور اس کا مزید ثبوت یہ ھے کہ اس کا ترجمہ عربی اور ترکی میں بھی ھو چکا ھے - پھر یہ بھی کہ پہلے ایڈیشن کی تکمیل کے جلد بعد اس کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس کی گئی ھے، چنانچہ اب اس کی تدوین ھو رھی ھے - بہر صورت اصل انسائکلوپیڈیا کی اھمیت کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ کہنا، بے ضرورت ھے - البتہ اس کے اردو ترجمے کے متعلق چند تصریحات ضروری ھیں -

سب سے زیادہ قابل ذکر بات اس ترجمے کے سلسلے میں یہ ہے کہ یہ انگریزی انسائکلوپیڈیا کا محض ترجمہ نہیں بلکہ اسے ایک لحاظ سے اصل کی بہتر اور مکمل‌تر صورت کہنا چاہیے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ لائڈن کا انسائکلوپیڈیا اکثر و بیشتر مغربی مستشرقین کا لکھا ہوا ہے ۔ اور ہر چند کہ ہم ان علماے مغرب کی مساعی حسنہ اور تحقیقی کاوشوں کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے، خصوصاً جب کہ ان کی کشادہ دلی نے عربوں، ترکوں اور اب پاکستانیوں کو استفادہ کرنے اور اس کا ترجمہ کرنے کی بلا تامل اجازت دے کر ہم پر ایک اور علمی احسان کیا ہے ۔ تاہم مستشرقین کا نقطۂ نظر ہر حال میں ، ان کا اپنا نقطۂ نظر ہے ۔ جس میں اگر تعصب کی جھلک نہ بھی ہو، تب بھی اس میں قدرے بے دردی و نافہمی، یک گونہ بے تعلقی اور ایک طرح کی بیگانگی کا رنگ پیدا ہو جانا بالکل قدرتی امر ہے ۔ لہذا کسی اسلامی ملک میں اس کا محض ترجمہ نہایت ناکافی اور ناقص بلکہ خطرناک طریق کار ہوتا ۔ اس لیے عربوں اور ترکوں کو، اور اب اردو ترجمے کے مرتبین کو یہ کوشش کرنی پڑی کہ اصل کے صالح اور مستند مواد کو برقرار رکھ کر اس کی روح اور اس کا لہجہ و مزاج بدل دیا جائے ۔ یعنی اس کے مضامین و بیانات کو مسلمانوں کے مذاق کے مطابق بنا لیا جائے ، چنانچہ عربی اور ترکی انسائکلوپیڈیا کی طرح، بلکہ ان سے بھی زیادہ اس اردو انسائکلوپیڈیا میں اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ اس کے بیانات میں اسلام کے نقطۂ نظر سے محققانہ انداز میں بالالتزام ترمیم ہوتی جائے ۔ اس کے علاوہ اصل میں جو مضامین و عنوانات موجود نہ تھے، ان کا اضافہ ہوا ۔ جن کو انگریزی انسائکلوپیڈیا میں شامل کرنے کے لیے کئی برس لگیں گے ۔ مثلاً جو عنوان "ت" میں شامل ہیں ، وہ انگریزی میں "T" کے ماتحت آئیں گے اور

اس جلد کی باری کہیں برسوں بعد آئے گی ۔ اس ضمن میں تاج الدین ابن ذکریا اور تخلص ایسے نئے عنوانات قابل ذکر ہیں ۔ اسی طرح بعض عنوانات کا مضمون بدل دینا پڑا ، مثلاً '' تجلید ،، اور '' تذہیب ،، میں کلیۃً نیا مواد پیش کیا گیا ہے ۔ آرٹ کے موضوع پر بہت سے مضامین نئے، اور بہت سے مضامین کا مواد ایسا ہے، جس کو اس وقت تک امریکہ اور یورپ میں بھی مکمل صورت میں پیش نہیں کیا گیا ۔ یہ سب ایسے مضامین ہیں جو لائڈن کے انسائکلوپیڈیا میں شامل نہیں ہیں ۔

اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اصل انسائکلوپیڈیا میں مغربی انداز نظر یا ماحول کے زیر اثر پاکستان و ہندوستان کی اسلامی تاریخ و تہذیب کے مقالات نسبتاً کم تھے ۔ اردو انسائکلوپیڈیا میں اس کمی کو بھی پورا کیا گیا ہے ۔ اور اس نقطۂ نظر سے مقالات بڑھائے گئے ہیں —— زیر تبصرہ اجزا کو دیکھ کر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو ترجمے کے مرتبین نے اصل پر مترجمانہ اعتقاد رکھنے کی بجائے سنین و واقعات کی جانچ پڑتال اور دوسرے مواد کی چھان بین بھی کی ہے ۔ اور اس مقصد کے لیے عربی اور فارسی کے اصل مآخذوں سے استفادہ کیا ہے ۔ اسی طرح عربی اور فارسی الفاظ کا صحیح تلفظ قائم کرنے میں بھی بڑی احتیاط سے کام لیا گیا ہے ۔ اور ترجمے میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ اصل کے مفہوم کو سادہ اور سلیس اردو میں ادا کیا جائے ۔ انگریزی انسائکلوپیڈیا کی بہت سی خامیوں کو دور کیا گیا ہے ۔ اور اصل کی فروگزاشتوں کا سراغ لگا کر تصحیح کی گئی ہے ۔ مثلاً اگر ہم صفحہ ۷۶ کالم ب کو اصل انگریزی مضمون کے ساتھ رکھ کر دیکھیں، تو اس امر کی وضاحت بخوبی ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح طرز تخاطب اور انداز بیان میں بھی ملکی آداب کے مطابق تبدیلی کی گئی ہے ۔

اس لحاظ سے اردو دائرہ معارف بڑی حد تک ایک لامثال اوریجنل تالیف بن گئی ہے ۔ بلکہ اصل ، عربی ترکی ترجموں سے بھی مکمل تر قاموس ہو گئی ہے ۔ پھر ایڈیٹنگ کی بے شمار جزئیات ، مثلاً نئی علامات و مخففات کی ایجاد، املا کے متعلق بعض اجتہادات اور رموز و اوقاف، جن کی چند صورتیں ملاحظہ ہوں :-

[ ]	..	اضافہ از ادارۂ دائرہ معارف اسلامیہ (اُردو)
[ ]ٓ	..	اضافہ در انسائکلوپیڈیا آو اسلام (انگریزی)
ـٖـ	..	e ـ کی آواز ظاہر کرتی ہے ـ مثلاً Bell بِل
ـٗـ	..	o ـ کی آواز ظاہر کرتی ہے ـ مثلاً Mole موٗل
ـْـ	..	علامت سکون یا جزم
ـ٥ـ	..	منازل راہ
<	..	مبّدل بہ

ان ندرتوں کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج تک اردو بلکہ شاید مشرق کی کسی زبان میں ایسی کوئی کتاب حوالہ ظہور میں نہیں آئی ہوگی ۔ یقیناً اس دائرہ معارف کی اشاعت سے اردو زبان جہاں تک علوم اسلامی اور اسلامی تاریخیات کا تعلق ہے، غیر معمولی حد تک با ثروت اور مالا مال ہو گئی ہے ۔ اور اس کے ذریعے ایک ایسی کتاب مہیا ہو گئی ہے، جس سے تحقیق کی مشکلات آسان اور جستجو کی راہیں کشادہ ہو گئی ہیں ۔ اس کارنامے کے لیے پنجاب یونیورسٹی اور دائرہ معارف کے رئیس تحریر مبارک باد کے مستحق ہیں ۔

(س ـ ع)

تبصرہ

شعر و حکمت

شعر و حکمت، حکیم نیر واسطی صاحب کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ھے، نام کی ندرت، موزونیت سے رشتہ بدامن ھے۔ حکیم صاحب شعرأ کے اس قبیلے سے متعلق ھیں جو طب اور شاعری کو ھم رشتہ کرتے رھے اور زمانے نے شاعری اور حکمت دونوں میں ان کی انفرادایت کو تسلیم کیا۔ حضرت نیّر شاعری میں اپنے مجموعۂ کلام مے کدہ وغیرہ کے ذریعے پہلے بھی کافی معروف ھیں۔ اب یہ تازہ کلام شعر و حکمت کے نام سے شائع ھوا ھے جس سے ان کا شاعرانہ مقام اور بلند ھوا ھے۔

شعر و حکمت کے مختلف عنوانات ھیں اور مضامین ان عنوانوں سے ظاھر ھیں، مثلاً محراب حرم ، یادرفتگان ، تیر نیم کش ، اشارات ، حکایت لذیذ اور شہر غزل ان میں سے ھر نوع کا کلام اس مجموع میں موجود ھے ، مثلاً نعت، قومی شاعری، رومانی نظمیں اور غزلیں ، مرثیہ و نوحہ، مناظر اور وصف، واقعات اور سانحات وغیرہ۔

حضرت نیر نو رومانی شاعروں کی صف میں رکھنے میں کوئی امر مانع نہیں مگر نیر کی شاعری میں مقامیت اور ارضیت کا رنگ کافی نمایاں ھے اس لیے ان کی اپنی ایک خاص انفرادیت بھی ھے۔ نیر کے یہاں رومانی فرار اور تخیلی خمول کی صورتیں ھونے کو تو ھیں، مگر ان کے یہاں اپنے ماحول اور مادی دنیا سے لگاؤ کی مثالیں بھی

کم نہیں ۔ واقعات و مقامات سے دلبستگی جو زندگی سے محبت کی علامت ہے ان کو حیات کا شاعر قرار دیتی ہے۔۔ ذوق فرار اگر ہے بھی تو گریزاں گریزاں اور دبا دبا معلوم ہوتا ہے،۔

نیر نے شعر و حکمت کے دیباچہ میں لکھا ہے : ''میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا کہہ دیا اور کہتا رہا تا آنکہ ایک کتاب بن گئی،، — اس سے ان کے مشاہدات کی بھی ایک خاص اہمیت، نکلتی ہے ۔ ان کے مشاہدے کی دنیا خاص وسیع ہے جس کو شاعرانہ انداز میں کہیے تو گویا مشرق و مغرب پر محیط ہے ۔ کاغان اور مری سے لے کر بنارس تک اور ایران سے لیکر مصر و عرب اور انگلستان، فرانس و جرمنی تک — ، ان مشاہدات میں شاعر نے حسن مناظر سے بھی تأثرات لیے ہیں اور حسن انسانی سے بھی، مگر جمال فطرت کے اس دائرۂ نور کے اندر اسے انسانی عظمت نے بہت متاثر کیا ہے، چنانچہ بوعلی سینا اور حافظ ، گوئٹے، وغیرہ کی بارگاہ فضیلت میں انھوں نے مشتاقانہ و والہانہ انداز میں گلہائے عقیدت پیش کیے ہیں ۔ غرض نیر ادھر رنگ و بو کے شیدائی ہیں اور ادھر عالم فکر و معنی کے بھی عاشق ہیں ۔

نیر کی نظم ان کی غزل سے بہتر ہے، 'مارگریٹ کے حضور میں' تعمیر کے لحاظ سے قابل توجہ نظم ہے ۔ ' ہائے کراچی ' میں جزئیاتی تفصیل خاصی ٹھوس ہے اور نظم مری میں بڑا حسن پایا جاتا ہے۔ نیر کی قومی اور وطنی نظمیں بھی واقعات سے وابستہ ہیں، مگر ان کی تہ میں انسانی محبت و عقیدت کا جذبہ رواں دواں نظر آتا ہے ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نیر کی شاعری میں واقعاتی رد عمل کی تحریک

کو خاصا دخل ہے — محض خیالی داخلی تحریک ان کے یہاں دبی ہوئی ہے—، اور یہ قدرتی بات بھی ہے، انھوں نے خود ھی لکھا ہے کہ ''اس کتاب کا ھر شعر زندگی کے کسی نہ کسی حادثے سے وابستہ ہے،، 'مگر حادثات سے ابھری ہوئی یہ شاعری، اگر غور کیا جائے تو ذاتی حد سے آگے بڑھ کر روداد جہاں معلوم ہونے لگتی ہے - مگر ان کے اس واقعاتی رد عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی غزل ان کی نظموں تک پہنچ نہیں سکی ——غزل کچھ زیادہ عمومیت ، زیادہ پردہ داری —— زیادہ ایما و اشارہ کی طلبگار ہے اور اس کے لیے کسی دوسرے قسم کے مزاج کی ضرورت ہے، مگر ان کی غزل میں اچھے اشعار کی کمی نہیں جن کا انتخاب اس لیے بے ضرورت ہے کہ انفرادی انتخاب ، ذوق کے تنوع کے ہم رکاب چل نہیں سکتا - ورنہ ان کے عمدہ اشعار غزل کی فہرست خاصی طویل ہے -

اب آخر میں مجھے ان کے دیباچے کے متعلق یہ کہنا ہے کہ یہ 'تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں، کا عمدہ مصداق ہے— ، اور مجھے تو ان کی نثر میں بھی شاعرانہ نوا سنائی دیتی ہے !

نیر کی شاعری ایک رتبے اور ایک حیثیت کی مالک ہے اس میں بہت سے دوسرے رومانیوں کے مقابلے میں زندگی زیادہ ہے اور حیات سے چسپیدگی اور اس کا ذوق صحت‌مندی کا نشان ہے - اسی لیے میں ان کی رومانیت کو صحت بخش شاعری کی صف میں رکھنے پر مجبور ہوں -

(س - ع)

مطبوعۂ
پنجاب یونیورسٹی پریس
لاہور